امامیہ مشن کا چونتیسواں ۳۴ تبلیغی رسالہ

(رجسٹرڈ)

خطیب آل محمد

مطبوعہ یوسفی پریس شش نہر لکھنؤ

قیمت ۱/۱۲ خرچہ ڈاک ۱/۲

آپ مذہب کی حمایت کیونکر کرسکتے ہیں؟

۱- امامیہ مشن کی ممبری قبول فرماکر؟ (قواعد طلب فرمائیے)

۲- امامیہ مشن کے تبلیغی رسائل خرید فرماکر۔

۳- امامیہ مشن کے استقلال فنڈ کے ٹکٹ خرید فرماکر۔

جس سے آپ کی مذہبی معلومات میں اضافہ بھی ہوگا۔ اور مشن کی امداد بھی ہوجائے گی۔

۴- امامیہ مشن کے رسائل ہم سے رعایتی قیمت پر خرید فرماکر غیر مذاہب میں مفت تقسیم کرکے۔ (جیساکہ بعض ہمدردان مذہب عامل ہیں)

امامیہ مشن ۳۹ تبلیغی رسائل چار سال کے اندر شایع کرچکا ہے! اور تین رسائل اسوقت زیر طبع ہیں جنکی کل تعداد ۶۵ ہزار سے اوپر ہوتی ہے۔

امامیہ مشن ہر سال عشرہ محرم میں اردو، ہندی، انگریزی رسائل غیر مذاہب میں مفت تقسیم کرتا ہے۔

امامیہ مشن نے لکھنؤ کی اچھوت کانفرنس میں دو زبانوں میں رسائل مفت تقسیم کئے ہیں۔

(خادم مذہب)

آنریری سکریٹری امامیہ مشن۔ لکھنؤ

خطیب آلِ محمدؐ

حضرت ملک الناطقین شمس العلماء
مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ
اعلی اللہ مقامہ

The Pioneer, Lucknow.

خطبات آل محمد

امامیہ مشن کی ۳۸ اڑتیسویں دینی خدمت

خطیبِ آلِ محمدؐ

ملت شیعہ کے سربلند مذہبی افراد کے کارنامہ ہائے زندگی کو محفوظ کرنا بھی ایک اہم اور قابل لحاظ فرض ہے۔

اس دور آخر میں شمس العلماء مولانا سید سبط حسن صاحب مرحوم سے دنیائے تشیع کو جو فوائد حاصل ہوئے وہ محتاج اظہار نہیں ہیں۔ مرحوم کے حالات زندگی میں رسالہ "حقائق" لکھنؤ میں ایک مبسوط مقالہ شایع ہوا تھا۔

ہم نے ضرورت محسوس کی کہ اس کو کتاب کی صورت میں شایع کر دیا جائے۔

انتہائی خوشی کی بات ہے کہ اسکے ساتھ جناب سید العلماء دام ظلہ کے قلم سے ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی شامل کیا جا سکا۔ نیز اصل مضمون کو بھی زیادہ مکمل کر دیا گیا ہے۔

اُمید ہے کہ افراد قوم اس رسالہ کو قدر کی نگاہ سے ملاحظہ فرمائینگے۔ والسلام

خادم مذہب، سید محمد رضا نقوی

آنریری سکریٹری امامیہ مشن مفتی گنج لکھنؤ

مقدمہ کتاب

(از قلم حقیقت رقم حضرت سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ دام ظلہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی
سید الانبیاء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین

کربلا کا واقعہ اپنی عظمت کے لحاظ سے ایک ایسا عدیم النظیر واقعہ تھا جس نے باحساس افراد کے دل وزبان کو ہمیشہ اپنے لئے وقف رکھا۔ اس کے اوپر حساس انسان نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور ان خیالات کے اظہار کا ذریعہ کبھی نظم رہی اور کبھی نثر۔

پورے طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ شہید کربلا امام حسینؑ کی یاد اور آپ کے واقعات پر اظہار افسوس پہلے نظم ہی میں کیا گیا۔ اگر اشعار دستیاب ہوتے ہیں کہ جو سب سے پہلے جناب ام کلثوم کی زبان پر جاری ہوئے۔

مدینۃ جدنا لا تقبلینا فبالحسرات والاحزان جئنا

تو حضرت زینب کبریٰ کے واقعۂ کربلا کے مرثیہ میں دلدوز نثری فقرات اس سے بہت پہلے عین واقعۂ شہادت کی شام ہی کو کتب تاریخ میں موجود ہیں۔

وامحمداہ صلّی علیك ملیك السّمآء ھٰذا حسین مرمل بالدمآء مقطع الاعضآء الخ

"اے نانا اے رسالت مآبؐ آپ پر تو ملائکہ آسمان درود و سلام بھیجتے رہیں اور یہ آپ کا نواسا حسینؑ خاک و خون میں آغشتہ ٹکڑے ٹکڑے جسم کے ساتھ پڑا ہوا ہے"

حضرت زینب و ام کلثوم اور امام زین العابدینؑ کے وہ خطبے یعنی تقریریں بھی جو کوفہ و شام میں ہوئی رہیں اس سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں اُس وقت جب جماعت توابین یعنی سلیمان بن صرد خزاعی اور ان کے ساتھیوں نے امام حسینؑ کے خون کا بدلا لینے کی قسم کھائی ہے اور بنی امیہ سے جنگ کے لئے کھڑے ہوئے رہیں اس موقع کی زلزلہ افگن تقریریں جنگ کے احساسات کو مشتعل کرنے کے لئے تھیں لیکن ان میں مقررین کو کربلا کے واقعات انتہائی دلدوز طریقہ سے بیان کرنے ہوتے تھے اور اس سے حاضرین پر گریہ و بکا کا غلبہ بھی ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں وہ مجلس یادگار ہے جو خود کربلا کی سرزمین پر قبر امام حسینؑ کے پاس برپا ہوئی ہے جس میں جنگ کے زما

مجاہد قبر پر شدت گریہ سے پچھاڑیں کھا رہے تھے - اور عجیب ہنگامہ کا عالم برپا تھا

بہ سلسلہ مختار ابن ابو عبیدہ ثقفی کی لڑائیوں میں بھی جو خاص خون امام حسین کے انتقام کے لئے تھیں جاری رہنا ضروری تھا اور اس کے بعد بنی امیہ اور بنی عباس کی سلطنتوں کے طاقت و اقتدار کی وجہ سے اگرچہ مقررین کے لئے یہ موقع حاصل نہ تھا کہ وہ عام طور سے ان تقریروں کو جاری رکھتے لیکن جب کبھی حکومت کے خلاف کوئی علم بلند ہوتا تو واقعۂ کربلا ہی وہ ایک واقعہ تھا جو مقرر کے لئے ایک کامیاب حربہ کا کام کرتا اور وہ اس عظیم الشان واقعہ کا سہارا ضرور ڈھونڈھتا -

زید شہید - نفس زکیہ اور حسین شہید فخ کے واقعات جہاد میں یہ عنصر خاص طور سے کارفرما دکھائی دیتا ہے -

اس کو ہم ذاکری حضرت سید الشہداءؑ کا وہ دور سمجھتے ہیں جس میں ذاکری ایک ہیجان انگیز اور ولولہ خیز تقریر کے ضمن میں ادا ہوتی تھی -

اسی لئے جب کوئی فتنہ اٹھکر خاموش ہوتا اور حکومت کی مادی طاقت اس کو پامال کرنے میں کامیاب ہوتی فوراً وہ سلسلۂ ذاکری بھی ختم ہو جاتا اور اس کی بنیاد باقی نہ رہتی -

ائمہ اہلبیت علیہم السلام جو دنیا میں امن و امان کے حامی تھے اور حکومتوں کے

خلاف شورش انگیزانہ اقدامات کو پسند نہ فرماتے تھے۔ انھوں نے اس طرح کے طریقہ ذاکری کی کوئی ہمت افزائی نہیں فرمائی لیکن انھوں نے یہ بھی نہیں چاہا کہ واقعہ کربلا کی یاد دلوں سے محو ہو جائے اسلئے کہ وہ یاد انسانیت و شرافت کے ان تمام جوہروں کے زندہ رہنے کی باعث تھی جو اس واقعہ میں حقیقی طور پر مضمر تھے۔

اس لیے ایک طرف تو ان حضرات نے خود اپنے ذاتی مخصوص مجالس میں پر امن و سکون طریقہ سے ذاکری کا سلسلہ جاری کیا یعنی اپنے اصحاب کے سامنے مختلف اوقات میں حضرت سید الشہداء کے واقعات شہادت کو بیان کرنا اس پر اظہار رنج و ملال کرنا اور دوسروں کو حزن و الم کے اثر سے متاثر کرنا جس کے ثبوت میں ریان بن شبیب وغیرہ کے روایات ہیں۔

یہ ذاکری وہ تھی جس میں ہیجان انگیزی کے عنصر کے بجائے حسرت خیزی اور غم انگیزی کا عنصر کار فرما تھا اور یہی وہ طریقہ تھا جس کو زمانہ کے انقلابات کے ساتھ بقاء و دوام حاصل ہو سکتا تھا۔ اور اسی پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانہ تک کے سلسلۂ ذاکری کی بنیاد قائم ہوئی ہے اور دوسری طرف شعراء کی ہمت افزائی کی گئی کہ وہ واقعات کربلا کے متعلق مراثی نظم کریں اور ان مراثی کو پڑھیں اس لئے کہ شعر میں خود بقاء دوام کی صلاحیت ہے اور ہمہ گیری کی طاقت ہے۔

ائمہ علیہم السلام کے زمانۂ ظہور کے بعد سے چند صدیوں تک ہم نہیں کہہ سکتے کہ بطور تقریر کے واقعات کربلا کے بیان کئے جانے کا سلسلہ کس طرح سے جاری تھا۔

بے شک اس کے بعد امام غزالی کا ایک فتویٰ ملتا ہے کہ یحرم علی الواعظ ذکر مقتل الحسینؑ الخ

"واعظ کے لئے واقعۂ شہادت امام حسینؑ کا تذکرہ کرنا حرام ہے اسلئے کہ اُس سے صحابہ کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔"

اس سے کچھ پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ میں واعظین منبروں پر واقعۂ شہادت امام حسینؑ کا تذکرہ کرتے تھے۔

ایران میں نویں صدی ہجری میں ملا حسین واعظ کاشفی نے کتاب روضۃ الشہدا تصنیف کی۔ اسکے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ذاکرین منبروں پر کتاب روضۃ الشہدا کو لیجاکر اُسی سے مصائب امام مظلومؑ کا تذکرہ کرتے تھے۔ اسلئے وہاں ہر حدیث خوان ذاکر کو "روضہ خوان" کہا جانے لگا اور یہ نام ابتک باقی ہے۔

ہندوستان میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ ذاکری کی ابتدا کب سے ہوئی۔ یہ ظاہر ہے کہ شروع شروع شعائر مذہب شیعہ سب ہی پردۂ خفا میں

تھے۔ بھلا عمومی طور پر مجالس کہاں منعقد ہو سکتے تھے ۱۲۰۰ھ کے بعد
جب لکھنؤ میں حضرت غفرانمآب مولانا سید دلدار علی صاحب طاب ثراہ
کے فیوض علمیہ و مجاہدات دینیہ سے مذہب کا چرچا ہوا۔ تو اُسکے بعد سے
ذاکری کا نشان بھی ملتا ہے جس میں پہلے طبقہ میں مولوی مداد علی صاحب مرحوم
مصنف بحر المصائب۔ مرزا ہادی صاحب صلاح مصنف خلاصۃ المصائب
کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ
کا معیار ذاکری صرف اتنا تھا کہ بجائے۔ لہوف مقتل عوالم وغیرہ مختلف
عربی کتابوں کی پوری پوری عبارتیں پڑھ پڑھکر اُن کا صرف
ترجمہ کر دیا جائے۔ یہ سامعین کے خلوص قلب و جوش ایمانی کا عالم
تھا کہ اُسی پر کہرام برپا ہوتا تھا اور رقت ہوتی تھی۔ آج اگر کوئی اُس
طرح سے پڑھے تو مجمع خاموش سنتا ہے اور کوئی اثر بھی نہ ہو۔

بہرحال اُس زمانہ میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل علم واعظانہ
انداز سے ذاکری کرتے تھے اور دیر دیر تک بیان فرماتے تھے۔ جیسے مولانا مرزا
محمد اخباری جو جناب سید العلماء سید حسین علیین مکان طاب ثراہ کے
شاگرد تھے۔ وہ یقیناً اپنے بیان میں مطالب علمیہ و مسائل دینیہ کا
بھی تذکرہ فرماتے تھے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کے بیان مطالب کا
انداز کیا تھا اور اُس کی صورت کس طرح تھی۔

ایک دور ذاکری کا وہ آیا کہ روایت کے ابتدا میں ایک عربی حدیث یا فقرہ روایت سے ابتدا کر کے پھر پورا بیان اُردو ہی زبان میں لیکن صرف تذکرہ واقعات کے طور پر ہونے لگا۔

اس قسم کی ذاکری اکثر لہجہ میں ہوتی تھی جو مختلف اشخاص کے لحاظ سے مختلف حیثیتیں رکھتا تھا میر محمد شاہ صاحب مرحوم کا خاص لہجہ تھا اور وہ انکے خاندان کے تمام شاگردوں میں بطور امتیاز خصوصی کے پایا جاتا تھا مولانا میر سید علی صاحب اہل علم میں سے تھے اس لئے وہ زیادہ تر احادیث و روایات کتب عربیہ سے بیان فرماتے تھے اور اُن کا ترجمہ کرتے تھے لیکن مثل بالکل قدیمی دور کے آپ کا بیان بالکل "ترجمہ" نہیں تھا بلکہ کہیں کہیں اثر بڑھانے کے لئے یا ربط دینے کے لئے کچھ تقریر اپنی جانب سے بھی کرتے تھے۔ آپ کی کتاب "مجالس علویہ" سے یہ امر ظاہر ہے۔

ایک خاص انداز اُس زمانہ کی ذاکری کا یہ بھی تھا کہ بہت سے ذاکر یکے بعد دیگرے ذاکری کرتے تھے اور بعد کا ذاکر اپنے قبل والے ذاکر کا تتمہ پڑھتا تھا۔ اس میں اکثر آخری ذاکر کو کسی پوری روایت کے بیان کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی بلکہ صرف چند فقرے ہوتے تھے جو اثر کر جاتے تھے۔ میر محمد شاہ مرحوم کے صاحبزادہ سید صاحب اس میں مشہور ہیں کہ وہ مختصر سے مختصر وقت میں مجلس کو زیادہ سے زیادہ متاثر بنانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

یہ سلسلہ بہت طویل الذیل ہے جس کے متعلق اگر وقت و فرصت

اجازت دے تو مستقل کتاب درکار ہے کہ ذاکری میں کس کس طرح سے انقلابات ہوئے اور مختلف ذاکرین کے خصوصی امتیازات کون سے تھے جن میں دوسرے لوگوں نے اُن کی تقلید کی۔

عراق میں آقا شیخ جعفر شوستری طاب ثراہ نے ذاکری میں اجتہادی رنگ پیدا کیا۔ سلئے کہ وہ خود جلیل القدر مجتہد اور بلند پایہ فقیہ تھے۔ اُنھوں نے باوجود مسلم الثبوت مجتہد ہونے کے ذاکری کو صرف وسیلۂ آخرت سمجھکر اختیار کیا اور اُس میں عجیب اثر پیدا کر دیا۔

اُنھوں نے واقعات مصائب میں نکات و توجیہات کے پیدا کرنیکا دروازہ کھولا اور اُس کو اپنی مجتہدانہ قوت استنباط سے بے نظیر طریقہ پر انجام دیا۔ ۱۳۰۳ھ میں اُن کا انتقال ہوا اور اُن کے بعد اُن کے رنگ کو برقرار رکھنے والا پھر ایران و عراق میں پیدا نہیں ہوا۔ آج بھی بعض ذاکرین ہیں جو اُن کی تقلید کرتے ہیں مگر صرف اُنہی کے نکات بیان کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔ نجف اشرف میں آقا شیخ محمد علی خراسانی واعظ کو میں نے مرحوم آقا شیخ جعفر کا نام لیکر بہت نکات بیان کرتے ہوئے سنا۔

اُردو زبان میں اور لکھنؤ کے اندر اُسی رنگ کے موجد اور مخصوص مجدد حضرت بحر العلوم آقا سید محمد حسین عرف آلن صاحب اعلی اللہ مقامہ تھے۔ وہ بھی چونکہ بلند پایہ محقق اور مجتہد تھے اس لئے اُن کو حق تھا کہ وہ واقعات

مصائب کے جزئیات کی توجیہ، بیان اسباب و علل اور ذکر نکات میں اپنی قوت نظر و استنباط سے کام لیکر وہ موشگافیاں کریں جنکی مثال نا ممکن ۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ رنگ جو جناب آلن صاحب قبلہ نے ذاکری میں پیدا کیا تھا وہ انہی سے پیدا ہوا اور ان ہی پر ختم ہو گیا اور وہ پھر باقی نہیں رہا ۔

ان کے تلامذہ نے جو ان کے فیض سے بہرہ مند ہوئے تھے پھر بھی اپنی قوت نظر سے کبھی کبھی ایسے توجیہات پیدا کئے ہیں جو انہی مرحوم کے توجیہات کا تتمہ قرار پا سکتے ہیں لیکن مستقل طور سے اس رنگ کو قائم کرنا اور برقرار رکھنا کسی لسان سے ممکن نہیں ہوا ۔

بہر حال جناب بحر العلوم اعلی اللہ مقامہ کو چھوڑ کر پھر ذاکری کا عام طور سے وہی رنگ تھا جس کی بنیاد پہلے سے قائم تھی ۔ یقیناً انسانی خیالات میں انقلاب ہوتا ہے اور معیار طبع بدلتا ہے اور اس سے خود بخود مختلف چیزوں کی صورت میں انقلاب پیدا ہوتا ہے ۔

ذاکری کے متعلق عام مذاق و رجحان طبیعت میں انقلاب جناب مولانا مقبول احمد صاحب کے آنے سے ہوا ۔ موصوف کے متعلق عام گرویدگی کا یہ عالم سنا ہے کہ لوگوں نے دن دن بھر کھانا نہیں کھایا ۔ جہاں خبر معلوم

ہوگئی کہ موصوف پڑھنے والے ہیں سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ موصوف کی سواری کے ساتھ اور پیچھے دوڑتے وہاں پہونچے اور اجتماع ہوگیا۔ موصوف ہی کے بیان سے ذاکری کے اندر مناظرہ کی آمیزش پیدا ہوئی اور یہ بات کسی نہ کسی صورت پر ابتک قائم ہے۔

یہ انقلاب فکار ابھی بالکل تازہ ہی تھا کہ جب مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کے ذاکری کی شعاعیں پھیلنا شروع ہوئیں موصوف نے ذاکری کو جو رنگ بخشا اُسکے وہی موجد تھے اس رنگ میں خاص چیزیں جنکو دخل حاصل ہے ذہن سلیم طبع سنجیدہ۔ مذاق صحیح ادب اور معانی بیان سے مناسبت حسن تقریر اور وسعت معلومات ہے۔ مولانا موصوف کی ہستی یقیناً اپنے کمالات کے لحاظ سے ایک بےمثال ہستی تھی جسکی مثال پیدا ہونا دشوار ہے۔ مبارکباد کے قابل ہے ادارہ "حقائق" کہ اُس نے موصوف کے حالات اس طرح شایع کئے ہیں جس سے نہ صرف موصوف کی شخصیت بلکہ اُن کے کمال فن ذاکری پر ہمیشہ کے لئے تیز روشنی پڑتی رہیگی اور انتہائی بامحل ہے "امامیہ مشن" کی یہ تجویز کہ اُس نے اِن حالات کو بطور کتاب شایع کرنے کا فیصلہ کیا۔ حقیقۃً ایسی ہستیاں جو باعتبار اپنے کمال کے خزانۂ تشیع کی زر و جواہر ہیں اُنکی یادگار کو محفوظ کرنا مذہب کی ایک صحیح خدمت ہے اسلئے یقیناً مشن کے مقاصد میں داخل ہونے کے قابل ہے۔

علی نقی النقوی عفی عنہ

۳۰ / جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۵۴ھ

خطیبِ آلِ محمدؐ

حضرت شمس العلماء مولانا السید سبطِ حسن طاب ثراہ

(از قلم رکن خصوصی ادارہ "حقائق")

دنیا صدیوں میں ایک باکمال پیدا کرتی ہے تو سینکڑوں برس تک پھر عقیم بھی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے ارباب کمال پر رونا آتا ہے اور اُن کے اُٹھنے سے کمی کا احساس ہوتا ہے۔

معصوم ہستیوں کا تذکرہ نہیں، وہ تو سطح امکانی سے بلند طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عام انسانی حدود میں یہ غیر معمولی اعجاز فطرت کا ہماری آنکھوں کے سامنے پیش ہوتا ہے کہ کسی فن کا کمال ایک ہی ہستی کو اپنا مرکز بنا کر پھر فلک کی لاکھوں گردشوں تک اسکی مثال لانے سے قاصر ہی نظر آتا ہے۔

مثال کے طور پر فارسی ادب کو دیکھیے، اسکی صدیوں کی ترقی نے ایک "فردوسی" پیدا کیا پھر سبھی آئے ہر ایک خاص درجہ کمال کا مالک بھی تھا

جدت وندرت حسن ادا وغیرہ کا دروازہ بھی فردوسی پر بند نہیں ہوگیا بہت سی فارسی شاعروں کا کلام ایسا ہے جس سے طبیعت لطف اندوز ہوتی اور سامع کو لذت محسوس ہوتی ہے لیکن "ثانی فردوسی" پیدا نہیں ہوا۔

اردو "غزل" میں باختلاف اسلوب میر اور غالب کی یہی صورت ہے۔ "مرثیہ گوئی" میں میر انیس اسکے یہ معنی نہیں ہوتے کہ انیس کے بعد یہ فن فنا ہوگیا اور میر انیس کے علاوہ دوسرے شعراء نے کوئی کمال النظم دکھلایا ہی نہیں۔ نہیں

"ہر گلے را رنگ بوے دیگر است"

مگر بندہ پرور! انیس کا مثل پھر پیدا نہیں ہوا۔ اردو فن خطابت یا موعظہ ذاکری حضرت سید الشہداء" میں جس کو عام الفاظ میں "حدیث خوانی" سے تعبیر کیا جاتا ہے ہمارے نزدیک مولانا **سبط حسن** صاحب قبلہ کو وہی درجہ حاصل ہے جو مذکورہ بالا ارباب کمال کو اپنے اپنے فن میں۔

خاندانی خصوصیات

مولانا سبط حسن صاحب قبلہ ددھیال کی طرف سے سادات کے اُس صحیح النسب شجرہ سے تعلق رکھتے تھے جس کی شاخیں "جائس" اور "نصیر آباد" میں پھیلیں اور ٹبرہی اور لکھنؤ تک بر سایہ افگن ہوئیں۔

آپکے والد جناب سید وارث حسین صاحب مرحوم تھے جنکے ساتھ خاندان

اجتہاد کے مشہور رکن نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب فاخر اعلی اللہ مقامہ کی ہمشیرہ کا عقد ہوا تھا اور جن کے صاحبزادے لکھنؤ کے مشہور شاعر اور اُستاد مولوی سید فرزند حسین صاحب ذاکر مرحوم تھے۔ آپ مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کے بڑے بھائی تھے اور دو برس ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کی والدہ مکرمہ جائس کے مشہور عالم دین مولانا سید علی حسن صاحب اعلی اللہ مقامہ کی صاحبزادی تھیں۔ آپ بڑے عالم متبحر اور ورع و تقویٰ میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ لکھنؤ میں جناب سلطان العلماء سید محمد صاحب قبلہ رضواں مآب اور ممتاز العلماء سید تقی صاحب قبلہ جنت مآب کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوئے اور مخصوص درجہ حاصل کیا۔ ابتک آپکے دیکھنے والے موجود ہیں اور آپکے بے مثال خصوصیات و اخلاق کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ولادت و نشو و نما

مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کی ولادت مشہور قصبہ جائس کی سرزمین پر ۱۲۹۶ھ ہجری میں ہوئی علم و تقویٰ کی فضا میں جو آپ کی ننھیالی خصوصیت کی وجہ سے حاصل تھی پرورش پائی اور بالکل ابتدائی تعلیم بھی جہانتک ہم سمجھتے ہیں جائس ہی میں حاصل ہوئی۔ عربی علم میں ترقی کا شوق کھینچکر لکھنؤ لایا اور آپکے بڑے بھائی جناب ذاکر صاحب کے رشتہ سے آپکے ماموں نواب مولوی اصغر حسین صاحب جنت

ناخر کی کوٹھی پر جو نرھی میں تھی آپ کا قیام ہوا۔ یہ مقام وسط شہر سے کافی دور ہے اور مدارس دارباب علم کا قیام تمامتر وسط شہر میں۔ بقول ہمعصر "الواعظ" اپنی قیامگاہ نرھی سے روزانہ دو ڈھائی میل کا راستہ پیادہ طے کر کے آتے اور ماہ صیام میں اکثر افطار کا وقت راستہ ہی میں گذر جاتا تھا۔"

آپ کی اس زمانہ کی تصویر بھی ہماری نگاہ میں موجود ہے۔ لاغر جسم۔ کتروان ڈاڑھی جس میں رخساروں کے اوپر تھوڑی جگہ خالی چہرہ سے محنت اور جفاکشی اور طالبعلمانہ سادگی ظاہر۔ یہ آپ کی اُس زمانہ کی صورت کے نمایاں پہلو ہیں۔

تحصیلِ علم

آپ کی تحصیل علمی کا زیادہ حصہ لکھنؤ کی مشہور درسگاہ "مدرسۂ ناظمیہ" میں گذرا۔ آپ یہاں مقدمات پڑھتے ہوئے داخل ہوئے تھے اور "ممتاز الافاضل" ہو کر نکلے اور یہ واقعہ ہے کہ آپ ہمیشہ مدرسۂ ناظمیہ ہی کو اپنا مدرسہ سمجھتے رہے۔ اور آپنے بحیثیت مدرس ایک عرصہ تک مدرسہ ناظمیہ کے طلاب کو فیوض بھی پہونچائے۔

جناب نجم الملۃ مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ دام ظلہ کو خاص اُستادی در تربیت روحانی کے رشتہ کی بنا پر ہمیشہ مولوی صاحب کہتے تھے اور مدرسۂ ناظمیہ کے تمام طلاب ہمیشہ مولوی صاحب ہی کے لقب سے آپکو یاد کرتے تھے یعنی جب مدرسۂ ناظمیہ کے کسی شخص کی زبان سے "مولوی صاحب" نکلے تو سوائے آپکے

کوئی اور مراد نہو سکتا تھا۔ اور جب آپ "مولوی صاحب" کہیں تو بغیر قرینۂ خاص کے سوائے نجم الملتہ کے کوئی اور مراد نہیں۔ اس سے خصوصی تعلقات اور بے تکلفانہ روابط کا بہت حد تک اندازہ ہوتا ہے۔

مدرسۂ ناظمیہ کا حقیقۃً وہ دور نہایت درخشاں دور تھا جب اس میں مولانا حافظ حکیم فرمان علی صاحب مولانا محمد ہارون صاحب زنگی پوری۔ مولانا محمد داؤد صاحب اور جناب مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کے ایسے اشخاص ایک ہی صف میں نظر آرہے تھے نہ ایسی جماعت مدرسہ کو پھر نصیب ہوئی اور نہ ایسے لوگ خاص مدرسہ سے پھر پیدا ہوئے۔

مدرسہ سے ممتاز الافاضل ہونے والوں میں ایسے دوسرے اہل کمال ہیں جو اسوقت بہت جلیل القدر درجوں پر فائز ہیں لیکن اُن میں بیشتر ایسے ہیں جن کی تحصیل علمی خاص مدرسہ میں نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اُنھوں نے علیحدہ سے تحصیل علم کرکے مدرسہ میں صرف امتحان دیا ہے اور سند حاصل کی۔

ایسے لوگ جنھوں نے خاص طور سے مدرسہ میں تعلیم پائی ہو اور اسی کی طرف انتساب رکھتے ہوں نہ مذکورہ بالا جماعت کے قبل اس پایہ کے پیدا ہوئے اور نہ اس جماعت کے بعد۔

آپنے اس دوران میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحان مولوی فاضل اور الہ آباد یونیورسٹی کے "ملا فاضل" اور اگر یاد غلطی نہیں کرتی تو شاید فارسی

امتحان "منشی فاضل" میں بھی شرکت فرمائی اور سندیں حاصل کیں، اسی طرح اپنے آخری دور تعلیم میں مدرسہ سلطان المدارس میں حضرت حجۃ الاسلام جناب سید باقر صاحب اعلی اللہ مقامہ سے تلمذ حاصل کر کے وہاں کے صدر الافاضل کا بھی امتحان دیا اور اس سند کو بھی حاصل کیا۔

اس دوران میں آپ نے لکھنؤ کے ایسے مرکز علم میں یقیناً دوسرے اہل کمال سے بھی استفادہ ضرور کیا ہو گا جن میں سے حضرت عماد العلما میر آغا صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ سے فقہ کی بعض کتابوں کا درس حاصل کرنا بھی معلوم ہوا ہے۔

آخر میں مدرسہ ناظمیہ کا آخری امتحان "ممتاز الافاضل" دیا اور اس میں بے نظیر طریقہ پر کامیابی حاصل کی۔

یہ واقعہ ہے کہ انسان کی ذاتی ذہانت وذکاوت خداداد ہوتی ہے، اس میں نہ استاد کی تعلیم کا دسترس ہوتا ہے اور نہ اس تعلیم کا کوئی اثر لیکن استاد ان ذاتی صلاحیتوں کے ظہور کا ذریعہ ضرور ہوتا ہے جو قدرت نے فطرت میں ودیعت کی ہیں اور اسلئے کسی باکمال شاگرد پر استاد کو ناز ش ہوتی ہے اور شاگرد پر استاد کا حق ہمیشہ کے لئے لازم الادا ہو جاتا ہے لیکن اس بنا پر انسان کے ذاتی کمالات مدح وستائش کا خود اسی کو مستحق بناتے ہیں کسی اور کو نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ مولانا محمد ہارون صاحب اور مولانا سبط حسن صاحب کے ایسے

جید الاستعداد طالب علم مدرسہ ناظمیہ سے پھر پیدا نہیں ہوے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ صلاحیت جوہر بہت بڑی چیز ہے جو محل کے ساتھ مخصوص ہے

ان حضرات کی جودت و ذہانت کا نتیجہ تھا کہ سرکار نجم الملتہ مد ظلہٗ کو جو مدرسہ ناظمیہ کے مدرس اعلیٰ اور ان حضرات کے استاد تھے۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ عراق سے امتحان کے پرچے منگوائے جائیں اور سرکار آیۃ اللہ سید کاظم طباطبائی طاب ثراہ جو عراق کے مستند فقیہ مجتہد تھے وہ ممتحن قرار پائیں۔

اس طرح مدرسہ ناظمیہ کو یہ ایک امتیاز خصوصی بھی حاصل ہو جائیگا کہ کہ یہاں کے ممتحن فقیہ شیعہ آقا سید کاظم طباطبائی ہوتے ہیں اور یہاں کے پرچۂ امتحان عراق سے بنکر آتے ہیں۔ عراق فقہ و اصول کا مرکز ہے وہاں ان علوم کا سمندر موجیں لے رہا ہے۔ رسائل و مکاسب وہاں کے اصلی نصاب تعلیم کی ابتدائی کتابیں ہیں یہاں یہ حالت ہے کہ رسائل و مکاسب بھی پوری داخل نہیں، چند ورق ہیں جو "ممتاز الافاضل" میں اور اس سے کچھ زیادہ حصہ ہے "صدر الافاضل" میں داخل ہے۔

اُس محدود نصاب تعلیم میں جو یہاں سے مقرر کیا گیا کتاب کے مندرجہ مطالب کے متعلق کچھ سوالات لکھے گئے اور سرکار آقا سید کاظم طباطبائی کی طرف سے وہ پرچۂ امتحان بھیجدیا گیا طلاب ذکی و ذہین۔ کتاب سمجھ کر پڑھی ہوئی حافظہ عمدہ اور یہ زور۔ جواب نہ دینے کے کیا معنی؟

فاضل، ذہین طلاب نے پوری محنت اور قابلیت سے جواب لکھے مولانا محمد ہارون صاحب اور مولانا سبط حسن صاحب ہر ایک نے اپنی خداداد ذہانت کے جوہر دکھلائے اور وہ جواب عراق بھیج دیئے گئے۔ سرکار آقا سید کاظم طباطبائی نے جوابوں کی تعریف فرمائی اور ہر ایک کو بہت ممتاز کامیابی کے نمبر عطا کئے۔

مدرسہ سے "ممتاز الافاضل" کی سند ملی اور غالباً خاص انعام "عمامہ، عبا" بھی ضرور ملا ہوگا۔

یہ ہے مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کی طالبعلمانہ زندگی جو اُن کے لیے بحیثیت ایک علوم عربی کے عالم متبحر قلمبند کی جا سکتی ہے۔ لیکن اُن کے وہ خصوصیات جنھوں نے انھیں "مولانا سبط حسن" بنایا اُن کی طالبعلمی کا دور عالم ظاہر سے تعلق نہیں رکھتا۔ وہ مدرسہ قدرت اور درسگاہ عالم فطرت ہے جہاں کی تعلیم ظاہری ذرائع سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اسکے مدارج تعلیم اور نصاب درس کا سمجھنا بھی ہمارے امکان میں نہیں اور نہ اُسکی ترقیوں کی حد بندی کیجا سکتی ہے۔

سلسلۂ تدریس

مدرسۂ ناظمیہ میں طالبعلمی کے زمانہ ہی سے طلاب کو آپکے فیوض پہونچتے تھے، فارغ التحصیل ہونے کے بعد سرکار نجم الملۃ والدین مدظلہ نے (بقول الواعظ) مردم شناسی جن کا خاص حصہ ہے اس خرد منتخب کا مدرسے سے بالکل بے تعلق ہونا پسند نہیں کیا، نیز اس توجہ

خاص کے لحاظ سے جو آپ کو اپنے بہترین شاگرد کے مالی مشکلات اور اسکی آیندہ ترقیوں کے متعلق بھی مبذول تھی آپ کو مدرسۂ ناظمیہ کے ایک درجہ کا مدرس قرار دیا۔ صرف مدرس ہی نہیں بلکہ آپ تمام مدرسہ کے ناظر بھی تھے اور اسی غرض خاص سے مدرسہ کا ایک مکان بھی جو مدرسہ سے بالکل متصل ہے آپکے زیر سکونت تھا۔

ہم اسوقت پورے طور سے نہیں بتا سکتے کہ آپ مدرسہ ناظمیہ میں کے سال تک مدرس رہے لیکن یہ سلسلہ اُسوقت تک قائم رہا جب تک مدرسۃ الواعظین قائم ہوا۔ جب مدرسۃ الواعظین کی بنیاد قائم ہوئی یہ وہ وقت تھا کہ مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کا آفتاب ترقی خط نصف النہار پر تھا۔ ایک طرف وہ توجہ جو جناب مولانا نجم الحسن صاحب قبلہ کو آپ کی طرف مبذول تھی ہی دوسری طرف خود مہاراجہ صاحب محمود آباد بانی مدرسۃ الواعظین کے خلوص اور آپکے کمال خطابت کے ساتھ گرویدگی کا نتیجہ تھا کہ آپسے مدرسۃ الواعظین کی پرنسپلی کے متعلق خواہش ہوئی جسے آپنے منظور کیا۔ اور مدرسہ کے درجہ اعلیٰ کی تعلیم آپکے متعلق ہوئی۔

اس عہدہ پر آپ ابتک تھے اور برابر آخر وقت تک رہے۔ شیعہ کالج کے قیام کے بعد وہاں کے طلاب کی علمی قابلیت کیلئے ایک لکچرار کی ضرورت محسوس کی گئی تو اسکے لئے بھی نظر انتخاب آپ ہی کے اوپر پڑی

چنانچہ آپ اس عہدہ کا بھی تعلق ہوا۔ ہفتہ میں ایک یا دو روز آپ وہاں تشریف لیجاتے تھے اور طلاب کے سامنے مذہبی تقریر فرماتے تھے۔ یہ تعلق بھی آخر وقت تک قائم رہا۔

یہ چیزیں وہ ہیں جو صرف "سوانح حیات" کی تکمیل کے لئے لکھی جاتی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ دنیا میں مدرسی کیلئے پیدا نہیں ہوے تھے۔ وہ اس فرض کو اپنی قابلیت سے انتہائی خوبی کے ساتھ انجام دیتے اور بات ہے مگر اصل جس چیز کے لئے اُنکی خاص خلقت ہوئی تھی وہ اسکے علاوہ ہے۔ اس کا تذکرہ اس "مقالہ" میں مقصود اصلی کے طور پر آخر میں آئے گا۔ اور وہی "معراج کلام" ہے۔

تبحر علمی مولانا سید سبط حسن صاحب مرحوم کے حالات طالبعلمی ہی سے ایک حد تک اُن کے علمی درجہ کمال کا اندازہ ہوگیا ہوگا انھوں نے وہ تمام علوم جو موجودہ مدارس ہند کے طرۂ امتیاز ہیں اُس درجہ تک حاصل کئے تھے جو فارغ التحصیل ہونے کے لئے ضروری ہیں جس کے ساتھ اُنکی ذاتی قوت نظر اور جودت طبع نے شریک ہوکر اُن کو ایک عالم متبحر کا درجہ دیدیا تھا۔

انھوں نے مدرسی کی زندگی ختم کرکے جادہ ہی دوسرا اختیار کیا اور کسی خاص قدرت کے الہام کی بنا پر اپنا راستہ ہی الگ کر لیا جس کے لئے وہ خاص طور سے

خلق ہوئے تھے، نہ انھوں نے مجتہد بننے کی کوشش کی اور نہ مجتہد کہلایا جانا پسند کیا اسلئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یقیناً وہ اگر اس راستہ پر آتے تو شاید بہت سے افراد کے آگے اُن کا قدم نظر آتا لیکن جب اُنھوں نے ایسا نہیں کیا تو اُنکے حالات میں قلم فرسائی کرنیوالونکو خواہ مخواہ اس امر میں طبع آزمائی کی ضرورت کیا ہی۔ اُن کے وہ کمالات کیا کم ہیں جن میں کوئی اُن کا شریک وسہیم نہ ہوا اور نہ ہے اور وہی ایک نشاپردازکے قلم سے کب لکھے جاسکتے ہیں جو ایسی غیر متعلق باتوں سے کلام کو طول دیا جائے۔

ادبیّت

اُن کو اُن تمام علوم کے علاوہ جو عام طور سے ایک فارغ التحصیل کو حاصل ہونے چاہیئے ہیں علم ادب کے ساتھ خاص شغف تھا اور طبیعت کو بھی اس سے خاص مناسبت حاصل تھی۔

اُنھوں نے علاوہ مدرسہ کی تعلیم کے اس فن میں مولانا سید محمد مہدی صاحب ادیب علی اللہ مقامہ سے بھی تلمذ اختیار کیا تھا اور شاید جناب سرکار ناصر الملۃ مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ دام ظلہ سے بھی استفادہ کیا ہو۔

دواوین عرب اور کتب ادب کا کثرت کے ساتھ مطالعہ کیا اور اشعار عرب اس کثرت کے ساتھ مستحضر ہوئے کہ تقریباً ہر موقع پر اُنھیں عربی شعر یاد آجاتا۔ وہ بسلسلہ گفتگو میں اکثر عربی اشعار پڑھ دیا کرتے تھے۔ اور اُن کی اُردو تحریریں میں بھی بجائے اُردو اشعار کے موقع بموقع عربی اشعار کی آمیزش ملتی ہی۔

معانی، بیان، بدیع جو ادب کے خاص ارکان ہیں انکی طبیعت میں اس طرح راسخ ہو گئے تھے کہ جزو فطرت بن گئے تھے۔ اور یہ ایک وہ چیز تھی جس نے اُن کو اس کمال کا حامل بنایا جس کا تذکرہ بعد میں آئیگا۔

مولانا نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ شاید ایک وقت میں یہ پابندی بھی کی تھی کہ آپس میں سوائے عربی کے بات نہ کریں۔ یہ گویا اس کمزوری کے احساس کی بنا پر تھا جو اسوقت عام طور سے عربی طلاب میں بمقابلہ انگریزی طلاب کے پائی جاتی ہے کہ یہ عربی میں بڑے درجہ پر فائز ہو جاتے ہیں اور عربی میں بات نہیں کر سکتے اور وہ ادیہ ذرا آگے بڑھے اور انگریزی میں بات چیت کرنے لگے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اہل علم کے ساتھ اُن کی تقریر اور تحریر میں عربی جملوں اور الفاظ کا کثرت سے بے ساختہ ورود ہونے لگا تھا۔ وہ جابجا ایسے عربی جملے بولدیتے تھے جو مخاطب کو پھڑکا دیتے تھے لطف یہ کہ وہ اسکے ایسے عادی بھی نہ ہو گئے تھے کہ بلا موقع غیر عربی داں مخاطب سے بھی گفتگو میں ان الفاظ کا استعمال کریں بلکہ ویسے لوگوں سے صاف اُردو میں بات کرتے تھے۔

علم کلام یہ بھی وہ شعبہ تھا جس سے مرحوم کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا اور جس میں اُن کو اپنے انداز بیان کی وجہ سے متوجہ بھی ہونا پڑا۔

اُن کو ہر آیت کے بیان میں فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کے مطالعہ کے بعد اُن خیالات کی رد ضرور کرنا پڑتی تھی جو اُنھوں نے اس تفسیر میں درج کیے ہوں اس میں شبہات کا حل بھی کرنا پڑتا تھا اور مختلف فیہ مسائل کا تصفیہ بھی - یہی اُن کا ذوق کلامی اور اسکے ساتھ حسن بیان وہ تھا جس کی بنا پر مدرسۃ الواعظین کی پرنسپلی کے لئے وہ شایان خیال کئے گئے اور اُن کو اس عہدہ پر منتخب کیا گیا -

مختلف زبانوں کی شاعری مولانا سبط حسن صاحب مرحوم کی طبیعت فطرت کی جانب سے شاعری کے ساتھ خاص لگاؤ رکھتی تھی - اُن کے نثر کلام میں شاعرانہ خصوصیات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے چہ جائیکہ وہ نظم کی طرف متوجہ ہوتے - اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی، فارسی، اُردو جس زبان کی طرف وہ متوجہ ہوئے اُنھوں نے اس میں ایک شیوا زبان اور کامل الفن شاعر کے لقب کا استحقاق حاصل کر لیا -

عربی ممدوح کا عربی کا کلام جہانتک ہم خیال کرتے ہیں بہت زیادہ نہیں ہے لیکن جتنا اُنھوں نے کہا خوب کہا - افسوس ہے کہ بحالت موجودہ صرف ہم اپنی یاد سے مدد لے رہے ہیں اور کوئی ذخیرہ ہمارے سامنے نہیں ہے اسلئے اس موضوع کو تفصیل سے قلمبند نہیں کر سکتے - اُن کے بعض اشعار ایسی مخصوص حیثیت رکھتے ہیں کہ زبان زد ارباب ذوق ہیں - یہ شعر اُن کا

خاص نسبت رکھتا ہے۔

سمرت فان تقبل شہادة کافر علیہ فسل لیلا بھیا ینوبنا

"کافر" کے معنی لغت عرب میں "چھپانے والے" کے ہیں اور غیر مسلم کو کافر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ "حق پوشی" کرتا ہے۔ زلفوں کو "کافر" اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ تاریک اور سیاہ ہوتی ہیں۔ عرفی نے زلف و رخ کی تعبیر کفر و ایمان سے کرتے ہوئے یوں کہا ہے ؂

ساغر لبریز کفر بر سر ایمان شکست

رات پردہ ڈالنے والی تاریک چیز ہے اسلئے اسکے "کافر" ہونے میں کیا شبہہ، دوسری طرف گواہی کے لئے عدالت کی ضرورت پھر چہ جائیکہ ایمان ندارد۔ کفر کی صورت ہو۔ اب شعر کے معنی سنئے اور لطف اٹھائیے۔

"رات جاگ کر بسر کی ہے اور شب بھر بیدار رہا ہوں۔ اگر کافر کی گواہی قبول کرنے میں تم کو عذر نہ ہو تو اسی شب تار سے پوچھ لو جو ہمیں کرتا یا کرتی ہے"

ایک دوسرا شعر اُن کا یہ ہے۔

وقرطان جولان کالقلب خافقا بنجمیہ، بالبدر التمام تعلقا

"معشوق کے دونوں بندے کانوں کے آگو شوارے) کیا حرکت کرتے ہیں گویا عاشق کا دل ہی جو ہل رہا ہے معلوم ہوتا ہے دو ستارے ہیں جو چودھویں رات کے چاند میں آویزاں ہیں"

کیا کہنا اس تخیل اور حسن تشبیہ کا۔ عربی میں خفق کی لفظ اضطراب کے معنی میں ہے قلب کے ساتھ بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ خفقان قلب مشہور ہے اور ستارہ کے ساتھ بھی (ما خفق نجم و غرب)

گوشواروں کو دل کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے (خافقا) کی لفظ استعمال کی جس سے قوت تخیل نے فوراً استارہ کی طرف ذہن منتقل کیا۔ گوشوارہ کو قلب خافق سے تشبیہ دیکر معشوق و عاشق کے باہمی ارتباط کا بھی پتہ دیا اُدھر بندے کانوں میں ہلتے ہیں اور ادھر عاشق کا دل ڈانواڈول ہے یا بیتابی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ یہ پہلی تشبیہ مفرد ہے۔ اب دوسری تشبیہ مرکب ملاحظہ ہو

"کنجمین بالبدر التمام تعلقا" چاند سا چہرہ اور اس میں گوشواروں کی آویزش، معلوم ہوتا ہے دو ستارے ہیں جو ماہ کامل میں آویزاں ہیں۔

اس سے بڑھ کے پوری تشبیہ کیا ہوگی؟

جناب ابو صاحب اعلی اللہ مقامہ کے انتقال کی انھوں نے تاریخ کہی تھی اس قطعہ کا ہر شعر خاص ندرت مضمون کا حامل ہے ملاحظہ ہو۔

ھوی جبل من آل عدنان راسیا فامست بقاع الارض اجمع لھدہ

بنی عدنان کی نسل کا ایک سربلند پہاڑ تھا کہ جو سرنگوں ہوا اور تمام حصص دنیا کو اسکے گرنے نے متزلزل کر دیا۔

منیع برد الطامحات کلیلۃ تری انجم الافلاک تجاوز حدہ

وہ حوادث زمانہ کی دسترس سے باہر، گھورنے والی نگاہوں کا خیرہ کرنیوالا سربلند پہاڑ کہ ستارہ ہائے فلک سے جس کی سرحد آگے نظر آتی تھی۔

قضی نحبہ والدھر یغشاہ صیتہ　　ولم یلف بحر فی الوری جزرہ مدہ

اُنھوں نے انتقال کیا اور انتقال کے ساتھ دنیا میں اُن کا آوازہ شہرت چھا گیا۔ ایسا سمندر آج تک نہ دیکھا تھا جس کا جزر (گھٹنا) اُس کا مد (بڑھنا) ہو۔

وفات کا ہونا "جزر" ہے اور شہرت کا دنیا میں زیادہ ہونا "مد" عجیب بات ہے کہ "جزر" نے "مد" کی صورت اختیار کی۔

لقد کان حیا ایۃ اللہ فی الوری　　وفی القبر امسی مصحفا خانہ جلدہ

وہ زندگی میں خدا کی ایک آیت تھے خلق خدا میں اور قبر میں وہ ایک قرآن ہیں جو جزدان میں رکھ دیا گیا ہو۔

تخیری لعراق منہ سیفا مھندا　　فیا حبذا سیف ویا حبذا غمدہ

عراق نے پسند کر لیا اس ہندی تلوار کو۔ کیا کہنا اس تلوار کا اور کیا کہنا اسکے نیام کا۔

فارخت عاما حل فیہ ضریحہ　　بکتہ جفون الشرع ناح لہ مجدہ

میں نے اُن کے سال وفات کی تاریخ میں کہا "شریعت[۱۳] کی آنکھیں ان پر گریاں اور مجد و بزرگی اُن کی نوحہ خواں ہے"

انھوں نے اپنے استاد معظم جناب سید باقر صاحب اعلی اللہ مقامہ کا مرثیہ بھی نظم کیا تھا۔ اسکے بہت سے اشعار خود مرحوم کے موجودہ سانحۂ ارتحال کے اوپر بالکل مطابق ہیں۔

ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے عربی کلام میں کس درجہ اسلوب عربیت کا لحاظ کرتے تھے وہ بالکل ایک اہل زبان عربی شاعر کا کلام معلوم ہوتا ہے جس میں کوئی تصنع و تکلف نہیں ہے اور کہیں آورد نہیں

قیل صبروا فالصبر فیہ جمیل قلنا ولکن المصاب جلیل

لوگ کہتے ہیں "صبر کرو صبر، صبر اچھی صفت ہے۔ ہم نے کہا مگر مصیبت یہ بہت بڑی ہے۔

قالوا الم تقرع لسمعک فضلہ قلنا بلی لکن لہ تاویل

وہ کہتے ہیں "کیا تم نے صبر کے فضائل نہیں سنے؟" ہم نے کہا "ہاں مگر اسکے دوسرے معنی ہیں"

قالوا خذوا عند الملاھی سلوۃ قلنا ھدیتم انہ التضلیل

وہ کہتے ہیں "لہو و لعب کی طرف متوجہ ہو اور اس میں دل بہلاؤ" ہمنے کہا خدا تمھاری ہدایت کرے یہ تو گمراہ کن باتیں ہیں"

قالوا الی کم تصطلون بنارہ قلنا ولا ینسی الخلیل خلیل

وہ کہتے ہیں "کب تک اس آگ میں جلتے رہو گے؟ ہمنے کہا دوست کو

دوست کہیں بھولتا بھی ہے ؟"

قالوا الیس لکم سواہا قبلۃ ۔ قلنا الیکم مالہا تحویل

وہ کہتے ہیں کیا سوائے اسکے تمہارا کوئی قبلۂ مقصد نہیں ہے۔ ہم نے کہا "بس بس یاد رکھو وہ قابل تبدیلی نہیں ہے۔

قالوا الا ترقی دموع عیونکم قلنا وکیف اذ الخد ودمسیل

وہ کہتے ہیں تمہاری آنکھوں کے آنسو رکیں گے نہیں ؟ ہمنے کہا کیونکر جب کہ رخسارے گذرگاہ سیلاب بن گئے ۔

قالوا الیس لذا الرنین ہوادۃ قلنا ومن لبعد الرنین عویل

وہ کہتے ہیں کیا اس آہ و نالہ میں سکون نہ ہوگا ۔ ؟ ہم نے کہا ابھی کیا ہے ، اس نالہ و آہ کے بعد تو اور فریاد بلند ہوگی ۔

قالوا عرتکم رجفۃ فتشتتوا قلنا وکیف اذ الجبال تمیل

وہ کہتے ہیں کہ" دیکھو تمھارے پیروں کے نیچے زمین لرز رہی ہے۔ اور زلزلہ آیا ہوا ہے جلدی منتشر اور پراگندہ ہوجاؤ "۔

ہمنے کہا پھر اسوقت کیا ہوگا جبکہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ رہے ہوں۔

قالوا اما الاصباح من لیلا تکم قلنا وتذکار اللیل طویل

وہ کہتے ہیں کیا تمہاری راتیں اب صبح سے ہمکنار نہ ہونگی ؟ ہم نے کہا رات کا افسانہ ہوتا ہی ہے طولانی ۔

قالوا سلوتم قبلہ عن فائت　　قلنا اذا ما ناب عنہ بدیل

وہ کہتے ہیں آخر اسکے پہلے جانے والوں کو تم بھول گئے ہو" ہم نے کہا ہاں مگر جب اُن کا کوئی قائم مقام ملجائے۔

لکنہ میت فقدنا شخصہ　　ونظیرہ فاستصعب التمثیل

لیکن یہ تو وہ جانے والا ہے کہ جو خود ہم سے جدا ہوا اور اسکی نظیر بھی مفقود ہے اسلئے اُس کی مثال ناممکن ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ خود مولانا کے سانحۂ وفات پر بار بار مولانا کے یہی دو شعر دوہرائے جاؤں"

قالوا سلوتم قبلہ عن فائت　　قلنا اذا ما ناب عنہ بدیل

لکنہ میت فقدنا شخصہ　　ونظیرہ فاستصعب التمثیل

حقیقت یہ ہے کہ اس ہستی کی نظیر مفقود ہے اور اس لئے اس کو بھولنا دشوار۔

فارسی شاعری

مولانا مرحوم کا فارسی کلام حقیقۃً آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اُس میں وہ اثر، وہ لطافت وہ حسن زبان ہے کہ ذوق اُس سے لطف اُٹھاتا ہے۔

"سبع سنابل" اور "سیپارہ دل" آپ کی فارسی نظم کے دو بہترین نمونے ہیں جن میں ادبی کمالات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔

یہ دونوں اس وقت نظم ہوئے ہیں جب آپ کسی خاص قسم کے "زہر" کے تکالیف میں مبتلا تھے۔

"سیپارۂ دل" مسدس کے طور پر ۳۰ بند ہیں جن میں حضرت سید الشہدا کی مدح کرتے ہوئے جابجا اپنی حالت کا اظہار کیا ہے۔

اس نظم کے چند بند بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو حضرت سید الشہدا سے خطاب کرتے ہوئے کس طرح سچی عقیدت کا اظہار ہو رہا ہے۔
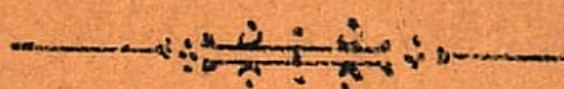
دفتر رحمت ز دلہائے، ملک تازہ ورق　　　خوانِ جودت را ز تدویرِ فلک شاہد طبق

یادِ تو دارد سپہر از غازۂ روئے شفق　　　رنگ خجلت می جہد تا حشر از تصویرِ حق

جانِ تن بیجاں تو در دین رسانم خستہ　　　کیست کو حق را شناسد جز تو نشناختہ
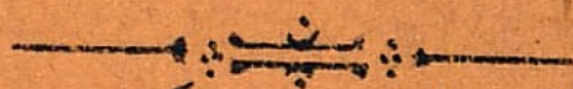
از تو پیدا شد صلاح عالم کون و فساد　　　سرفگندہ بر درت انسان و حیوان و جماد

شانِ ولایت نرفت از دیدۂ گردوں نہ دید　　　دست بر عرشِ شریعت پا بمیدان جہاد

پا نہ جنبید از مقامش تا بتن سر داشتی

از فرس افتادی و آب آسماں برداشتی

بر تو گریم تا توانم بلکہ تا جانم بود　　　بلکہ تا شام مزار و صبح اکفانم بود

بلکہ تا آں دم کہ صبح حشر پنہانم بود　　　بلکہ تا صہبائے کوثر بر سر خوانم بود

تا بخندد گل گلشن چشم گریاں زندہ باد
ایں چراغ بزم تا شام ابد رخشندہ باد

کشتیم بشکست اے نوح غریبان العجل — مور تو پامال گردید اے سلیمان العجل
تا رسید شام دلم اے مہر تابان العجل — زہر خونم ریخت اے شاہ شہیدان العجل

گرچہ من در ہند و تو در کربلا ہستی مقیم
فصل نبود درمیان سائل و دست کریم

آپ نے اپنے اسی مرض میں جو "زہر" کا نتیجہ تھا اپنے کرب و بےچینی کا اظہار حسب ذیل رباعی کے ساتھ کیا۔

اے کہ مظلومی دعالم را معینی یا حسینؑ — خامس آل عبا و رکن دینی یا حسینؑ
تا دو دیدہ دردہ کرب دارد صبح و شام — کے تواند زیست گر سوئش نہ بینی یا حسینؑ

اصل واقعہ زہر کو بھی آپ نے کتنے موثر انداز سے نظم فرمایا ہے۔

سبز برگے را بزہر لالہ گوں انباشتند — ہر مرا دادند و قتل من ثواب انگاشتند
جز تنائے نو خطائے من نباشد یا حسینؑ — حرمت تو اے ذبیح کربلا خوش داشتند

"سبع سنابل" ہفت بند ملا کاشی کے انداز پر حضرت حجت عجل اللہ فرجہ کی مدح میں نظم کیا ہے۔ خود کہتے ہیں

کاشی کہ در ایں جہاں لب مدح کشود — ہم قلب زمانہ بر د و ہم خلد ربود
ایں دل کہ باتباع رہبر نازد — بر نقش قدم نہاد و راہے پیمود

اس ہفت بند میں تیسرے بند میں اپنی حالت نظم کی ہے جو درج ذیل ہے :-

آب آتش چشم و دل در جسم و جاں انداختہ
صبر را بنگر کہ قفلے بر دہاں انداختہ

از دلِ دشمن زبا بر رشک خارے سر کشید
سر بکامم داد دلبستر بر زباں انداختہ

جاہ از حیرت دہن بکشاد و پیشہ خموش
لیک مید انم کہ او را کار رواں انداختہ

با دل بے مایہ غمگین ہمی نازم بدہر
کو در ایں فانی سرا طرح فغاں انداختہ

ز اہلبیت مصطفےٰ خواہم اماں در باغ دہر
زاں کہ گلچینی نظر بر آشیاں انداختہ

قائم آل عبا لطفے بہ من کز آسماں
شاہد عالم بدوش خود کماں انداختہ

چوں پئے تقریب عہدت ہست دوران سپہر
شوق تو جانے بجسم آسماں انداختہ

ناخن مشکلکشائیت در کف و ایں روزگار
در گلویم از مرضہا ریسماں انداختہ

کار حذاق جہاں نبود علاج نفس من
از تو نیر و خواہد ایں جسم تواں انداختہ

عندلیب نغمہ زن بودم بہ صبح نور تو
کایں شب یلدا حجابے بر اذاں انداختہ

از ولائے تو کفِ موسیٰ میان رود نیل
چاک اندر دامن آب رواں انداختہ

توسنِ عالم تہ رانت مبارکباد من
بر طریق انتظارم جسم و جاں انداختہ

من فقیر ابن فقیرم تو امیر ابن امیر
اے مغیث مستغیثان جہاں دستم بگیر

چھٹا بند حسب ذیل ہے :-

تا ترا حکم است اقلیم بلا برباد باد — ہر اسیر عشق تو از بند غم آزاد باد
ذرہ کو بیت پناہ آں ذلے باشد گہ گفت — زیر رواق چرخ زیر دامن فریاد باد
آں خس بے قدر کز وے آشیانے ساختم — از کرم ہائے تو میل دیدہ صیاد باد
قابل اقبال وجہ تو نیم از فرط جرم — تا فراموشم کنی ذکر تو مارا یاد باد
خاطرم در ورد اسم اعظم تو روز و شب — انبیاء از ذکر تو سرمایہ اوراد باد
ایں مرض با من بود تا آں کہ فرمائی ز لطف — خوش تو لاگاہ من شاد ایں دل ناشاد باد
ایں تامل چیست در امداد من اے جان خلق — اے ز تو معمورہ کون و مکاں آباد باد
جز دوائے درد دل چیزے نمی خواہم بدہر — من نگفتم بہر دشمن خانہ اش برباد باد
اے سلیماں جہاں شاہ حکمراں جزو و کل — تا بکے پیچید برگہائے دل غم زاد باد
غیر استحقاق الفت نیست اندر دست من — وز تو لا بت صلاح عالم ایجاد باد
آنچہ بر غیر اساس حب تو گردد بلند — آں بنائے عنکبوتی سست و بے بنیاد باد
شام دنیا دوستانت را چراغ بزم عیش — صبح محشر بہر ما دیباچہ اعیاد باد

من فقیر ابن فقیرم تو امیر ابن امیر
اے مغیث مستغیثان جہاں دستم بگیر

سیپارۂ دل کے ایک بند سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ کے مرض کی مدت کتنی طولانی ہو چکی تھی جب آپ نے اسے نظم کیا ہے۔ وہ بند یہ ہے۔

استعانت از تو جویم در حیات فانیہ — ہم ز تو خواہم جانِ ہم قطوف دانیہ

بنگر ایں طول مرض اے رحمتِ ربانیہ — آخر ذیقعدہ از ماہ جمادی الثانیہ

چوں تو مولیٰ دارم و در دل گرہ دارم ہنوز

مدتے بگذشت و چشم خود بره دارم ہنوز
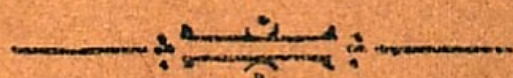
اُردو شاعری

اس باب میں کچھ زیادہ بسط دنیا ایک حد تک آفتاب کی روشنی کو چراغ میں دکھانا ہے۔

وہ شخص جسکے وقتی نثر کلام کا ایک ایک لفظ جان شاعری اور روح تخییل ہو جس نے اپنے بیان سے اُردو میں الفاظ و محاورات کی ایک دنیا خلق کی ہو وہ اگر اُس زبان میں شعر نظم کرے تو وہ کیسا ہوگا اسکے لئے کسی بیان کی حاجت نہیں ہے۔

انھوں نے شاعری بحیثیت فن اور خاص مشغلہ کے اختیار نہیں کی اُن کو مطالعہ، فکر مطالب، اور مجالس میں بیان سے فرصت کہاں تھی کہ وہ بیٹھکر شاعری کرتے لیکن اُن کی قوت شاعری اُس پیمانہ پر تھی کہ جب وہ کچھ کہہ دیتے تھے تو وہ اکثر شعرائے وقت کے معیار طاقت سے بلند کلام ہوتا تھا۔

اُنکی شاعری کبھی منظر عام پر نہیں آئی لیکن اُس کا شہرہ ہمیشہ اہل دل پر رہا

بہت بڑی اضافہ کا باعث ہو۔

آپ نے ایک مثنوی بھی نظم فرمائی تھی اُس زمانہ میں جب آپ شروع شروع زیارت عتبات عالیات سے مشرف ہوئے تھے۔ اُسی زمانہ میں آپ کی نوجوان صاحبزادی کا انتقال ہو گیا تھا۔

اس مثنوی میں مشاہد مشرفہ کی زیارت اور اس سانحۂ انتقال دختر دونوں کا تذکرہ ہے۔

یہ مثنوی بھی افسوس ہے کہ شایع نہیں ہوئی۔ اسکے بعض اشعار جو بعض احباب کی زبان سے اُن کے حافظہ کی مدد سے سنائی دیے وہ حسب ذیل ہیں۔

آغاز مثنوی

مصنوع زباں ہے خدا کی	منزل درپیش ہے ثنا کی
پھر کس طرح باب حمد کھولے	حیران ہے چپ رہے کہ بولے
بولے تو حواس باختہ ہے	چپ ہو تو اُسی کی ساختہ ہے

حضرت ابوالفضل العباس کے روضۂ مقدس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد کیا ہے:۔

فرزند رشید نفس مرسل	تصویر رخ امام اوّل
تھا محو جلال قبر تا دیر	روضہ تھا کہ ایک بیشۂ شیر

بہت بڑی اضافہ کا باعث ہو۔

آپ نے ایک مثنوی بھی نظم فرمائی تھی اُس زمانہ میں جب آپ شروع شروع زیارت عتبات عالیات سے مشرف ہوئے تھے۔ اُسی زمانہ میں آپ کی نوجوان صاحبزادی کا انتقال ہو گیا تھا۔

اس مثنوی میں مشاہد مشرفہ کی زیارت اور اس سانحۂ انتقال دختر دونوں کا تذکرہ ہے۔

یہ مثنوی بھی افسوس ہے کہ شایع نہیں ہوئی۔ اسکے بعض اشعار جو بعض احباب کی زبان سے اُن کے حافظہ کی مدد سے سنائی دیے وہ حسب ذیل ہیں۔

آغاز مثنوی

مصنوع زباں ہے خدا کی | منزل درپیش ہے ثنا کی
پھر کس طرح باب حمد کھولے | حیران ہے چپ رہے کہ بولے
بولے تو حواس باختہ ہے | چپ ہو تو اُسی کی ساختہ ہے

حضرت ابوالفضل العباس کے روضۂ مقدس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد کیا ہے:۔

فرزند رشید نفس مرسل | تصویر رخ امام اول
تھا محو جلال قبر تا دیر | روضہ تھا کہ ایک بیشۂ شیر

دیدار کا کس کو حوصلہ تھا | ہر دل کی زمیں میں زلزلہ تھا
وہ حسن کہ دل پسند ہو جائے | وہ رعب کہ آنکھ بند ہو جائے

عاشور کی گرمی کے متعلق کہتے ہیں :-

تھا چشمۂ مہر جل کے پایاب | خورشید پہ چھوٹتی تھی مہتاب
تھا موم مآل کار داؤد | بے کار تھا ذکر نار نمرود
سینہ سے دہن میں کھنچ کے سانس آئے | کانٹوں میں زباں کے آگ لگ جائے

عاشور کی لڑائی کے سلسلہ میں ۔

تلوار جو خون میں بھر گئی تھی | کافور میں آگ لگ گئی تھی

متعلق انتقال دختر

اول تو مجھے نصیب کیا تھا | تھا بھی تو اسے نصیب کیا تھا
ہر چیز سے آنکھ بند کر لی | تھوڑی سی زمین پسند کر لی
قبر اسکی بنی بگڑ گیا میں | گھر اس کا بسا اجڑ گیا میں

ایک شعر ان کا بہت مشہور ہے ۔

غرق عرق ہوں تا گلو خدنہیں انفعال کی | بس مرے پردہ پوش بس ہو مرا حساب ہو چکا

ایک اور شعر یہ ہے ۔

طینت آدم میں تھی اللہ کیا نشو و نما | ایک مٹھی خاک یوں پھیلی کہ دنیا ہو گئی

آپکے شہرۂ کمال شاعری کا یہ ایک واقعہ چشم دید ہے کہ لکھنؤ کی کسی انگریزی

درگاہ غالباً جو دہلی میں بڑا مشاعرہ تھا جہاں تمام اکابر شعراء مدعو تھے۔ مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کے چھوٹے بھائی مولوی سید کامل حسین صاحب نے اُس مشاعرہ میں غزل پڑھی جس نے زمین مشاعرہ میں زلزلہ ڈال دیا۔ شعرائے حاضر الوقت کا کلام تہ ہم پڑگیا۔

بڑے بڑے کامل الفن اُستادوں کا مولانا کے پاس یہ پیغام پہونچا کہ حضور کو اگر شاعری کے میدان میں قدم رکھنا ہے تو بچوں کے ہاتھ سے ہماری آبرو کیوں لیتے ہیں؟

مولانا نے فرمایا کہ وہ اشعار میرے نظم کئے ہوئے نہ تھے بلکہ صرف میری اصلاح تھی اور اسی لئے مطلع ہی میں میں نے ایک غلطی رہنے دی تھی نکالی نہ تھی کہ دیکھوں حضرات کی نظر اُس پر پہونچتی ہے یا نہیں؟ پھر آپ نے وہ غلطی بیان فرمائی جس کا حاضرین نے اقرار کیا۔

طرز تحریر یا انشا پردازی

مضمون نگاری میں مولانا کی تحریر کبھی تو بہت صاف اور سادہ، پرمغز ہوتی تھی جس میں سلجھی ہوئی لفظوں میں بیان مطالب کے علاوہ کوئی خاص عبارت آرائی اور رنگینی ملحوظ نہ ہوتی تھی اور کبھی اُس میں معانی و بیان کی مناسبتیں اور استعارہ و کنایہ کی لطافتیں ایسی ہوتی تھیں کہ وہ صد درجہ دلآویز معلوم ہوتی تھی یہ دوسری قسم کی عبارت وہ ہوتی ہے جس میں مولانا مرحوم کے مخصوص طرز بیان

کی بڑی جھلک پائی جاتی ہے اور اس لئے ہم اس کو خاص اہمیت دینے پر
مجبور رہیں۔

پہلی قسم کی عبارت کا نمونہ

یہ وہ ہے جو "الواعظ" میں بطور انتخاب شایع کیا گیا ہے۔ آپ کا ایک مضمون
"واقعہ کربلا کی عظمت" پر شایع ہوا تھا اُسکے ابتدائی سطور درج ذیل ہیں۔
"کسی واقعہ کے عظیم ہونے کی جانچ اگر کرنی منظور ہو تو اُسکے قبل بعد
کو دیکھو، پھر اُسکے تاثیرات کا پتہ لگاؤ، اُن چیزوں کی نوعیت پر نظر کرو جن پر
اُس واقعہ نے اپنا اثر ڈالا ہے۔ اگر وہ چیزیں جو اس واقعہ سے متاثر ہوئی
ہیں معمولی ہوں تو اُس واقعہ کو معمولی سمجھو اور اگر وہ چیزیں معمولی نہ ہوں
تو اُس واقعہ کو بھی غیر معمولی سمجھو۔ دنیا کے ہزاروں واقعات پر ایک سرسری
نظر ڈال کر دیکھو تو اُن میں چند طرح کے تغیرات معلوم ہونگے یا ایک سلطنت
دوسری حالت پر منتقل ہوگئی ہوگی اور اُس سے نظم و نسق اور طرز حکومت میں
فرق آگیا ہوگا یا ایک طرز و طریقہ دوسرے انداز و رفتار سے بدل گیا ہوگا۔
عام اس سے کہ وہ سلطنت اپنے فرمانروا کے ماتحت باقی رہی ہو یا نہ رہی ہو یا خونریزیوں نے
تاسف کے آثار پیدا کر دئے ہونگے اور مادہ ظلم اور زیادہ ہوگیا ہوگا یا کمی ہوگئی ہوگی
بڑے بڑے واقعات کے تاثیرات اتنی ہی ہیں اور جزئیات جو عالم کون و فساد میں
ہوتے رہتے ہیں اُن کا شمار اور اُن کے آثار کا شمار نہیں کیا جا سکتا مگر محدود

ہونے پر بھی وہ عظمت نہیں پیدا ہوتی جس سے ہم اسوقت بحث کر رہے ہیں۔ واقعہ کربلا جب اس کسوٹی پر رکھ کر جانچا جاتا ہے تو وہ اپنی نظیر کا کوئی دوسرا واقعہ نہیں رکھتا۔ پہلے یہ دیکھو کہ اس واقعہ کے اسباب کہاں سے اور کیونکر پیدا ہوے۔ ہر چیز کے لئے جو واقع ہو اُسکے پہلے کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو آنے والے تغیر یا ہونے والے واقعہ کے لئے یا اسباب ہو جاتی ہیں یا اسباب پیدا کر دیتی ہیں۔

پھر ایک نظر یوں ڈالو کہ اس عظیم واقعہ کی ظالمیت اور مظلومیت کن دو حصوں میں منقسم تھی۔ ظالم کون تھا اور مظلوم کون؟ پھر ایک نظر یہ بھی دیکھو کہ رسول اللہؐ کا تعلق مظلوم سے زیادہ تھا یا ظالم سے؟ پھر ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھتے جاؤ کہ کسی ایک فریق سے نبیؐ کا تعلق اگر تھا تو معمولی تھا یا غیر معمولی؟ پھر ایک نظر اس سمت بھی کرنا چاہیے کہ عرب کی وحشیانہ اور جاہلانہ رفتار جس تعلیم سے زائل ہو چکی تھی اور وہ قوم تمام تہذیب کے اعلیٰ پیمانے حاصل کر چکی تھی ۵۰ برس کا فصل نبی اور اُمت کے درمیان میں پڑ جانے سے وہ تعلیم کیونکر زائل ہو گئی اور کیونکر ان میں اس شدید جاہلیت کے ایسے آثار پیدا ہو گئے جو زمانہ جاہلیت میں بھی موجود نہ تھے پھر غور سے اسبات کو بھی ڈھونڈو کہ اس تعلیم نبوی کا زوال تدریجی ہوا یا دفعتہً؟ پھر اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی جانچتے جاؤ کہ کس چیز نے اُنکی پہلی تعلیم اور شائستگی میں فرق ڈالدیا یہاں تک کہ یہ

سوادِ جبل بڑھتے بڑھتے فوجِ شام کی صورت میں نظر آنے لگا۔"

دوسری قسم کی عبارت کا نمونہ

محرم کی آمد ہے اور اس موقع پر تحریر ہوتا ہے۔

"وقت وہ ہے کہ آسمانی روشنیاں جھلملا رہی ہیں جن پر کسی پر زور آندھی بلکہ قومِ عاد کی غضبناک ہواؤں کا بھی اثر نہیں ہوا لیکن آج آسمان کا فانوس افق کو اور ان کی ضیاء دلفروز کو بچا نہیں سکتا۔ انسانوں کے مظالم کی سیاہ گھٹا شامی افق سے اٹھی اور سوادِ کوفہ کو اپنا شریک بناتی ہوئی۔ چراغِ حرم کو خاموش کرتی ہوئی، روضۂ پیمبر میں اندھیرا کرتی ہوئی، آسمان کا رخ کیا اور کسی ستارہ کو اس نے گہن کی بلا سے امان نہ دی۔ ماہتاب کہنے کو تو چاند ہے لیکن آج تو داغِ دلِ اہلِ ماتم ہے، آفتاب نیّرِ اعظم کہا جاتا ہے لیکن کبھی اس نے اتنا بڑا کسوف نہیں جھیلا جیسا کہ اس کو دہم محرم کو درپیش ہوا۔

کیسا ماتم؟ کونسا غم؟ کیا ہوا؟

مجھے نہیں معلوم کہ کوئی دنیا میں ایسا بھی ہے جس کو یہ سمِ معلوم نہ ہو، عشرت پسند دل جو واعظوں کی آواز پر کان نہیں لگاتا اور اپنی ہوا و ہوس پر جان دیتے ہوئے زندگی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ محرم کا

چاند دیکھتے ہی توبہ کر کے بیٹھ گیا اب وہ ایک زاویہ نشین زاہد ہے جسے دنیا اور اُسکی آرزوئیں دعوت پر دعوت دے رہی ہیں لیکن وہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اگر اُس سے پوچھیے کہ کس منزل پر ٹھوکر کھائی؟ کیا مصیبت گذری؟ تو وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھ کا آئینہ پیش کر کے خاموش ہو جائے گا۔ مکانات جن میں اس مہینے سے پہلے رونے کی آواز کا نام لیا جاتا تو ان کے رہنے والوں کے چشم وابرو پر بل پڑ جاتے لیکن آج ان مکانوں میں ہنسی کی آواز اتنی ہی بری معلوم ہوتی ہے جیسی اس زمانہ کے قبل رونے کی آواز ناگوار ہوتی تھی۔ دنیدار اہل ثروت مسندیں اُلٹے ہوئے بزم ماتم کے سجنے پر آمادہ ہیں۔ فقراء اپنے جھونپڑوں میں ایک چراغ جلائے ہوئے بھرے دلوں کو خالی کر رہے ہیں۔ زبانوں کو مشغلۂ ذکر مول لے چکا ہے، وہ اپنی خدمتوں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ہاتھ ماتم میں وقف ہیں۔ ان اعضا سے دل نے کچھ کہدیا ہے۔ وہ نہ معلوم کیا کہا کہ سامان غم کی فراہمی میں اتنا ہی غرق ہیں جسقدر امکانی اسباب سرور کے مہیا کرنے میں مشغول ہو سکتے ہیں۔

ہم نے یہ سب سنا مگر کس کا غم ہے یہ نہ معلوم ہوا

ہمیں امید نہ تھی کہ کوئی یہ سوال کر سکیگا کیونکہ دنیا کا ہر ذرہ اور آسمان کا ہر ستارہ اس شخص کو جانتا ہے جس کا ماتم ہے۔ دوستوں کا کیا ذکر دشمنوں کو بھی

معلوم ہے، ہم اتنا بتائے دیتے ہیں کہ اگر اس کی قدر معلوم کرنا چاہتے ہو کہ
اسلام میں اسکی وجاہت کیا تھی تو عموم غم و ماتم کو دیکھو جس میں تمھیں
علماء سر برہنہ نظر آئینگے، فقہاء اس غم کے عبادت ہونے کا فتویٰ دیتے ہوئے
دکھائی دینگے صلحاء واتقیا اس غم سے احتراز کو خلاف صلاح اور خلاف
تقوےٰ سمجھتے ہوئے ملیں گے، عامۂ مومنین اس کو ایک دینی آبائی
رسم تصور کرتے ہونگے۔ اگر اسکی مظلومی کی تاریخ منظور ہو تو غیر فرقوں کا
متاثر ہونا دیکھو جن کو دین سے کوئی تعلق نہیں اگر محبوبیت رسول کا امتحان
مقصود ہو تو ام سلمہ کا خواب جس میں پیغمبرؐ ہو بحضر یہ خاک ملے ہوئے
نظر آیا در انحالیکہ وہ برہنہ سر بھی تھا۔ اگر اسکے مویّد من اللہ ہونے کی
داستان طویل سننا چاہتے ہو تو اسکی عزا کے بقا کا لحاظ کرو جس کے روکنے
کیلئے ہر سال بہت سے گروہ کمر ہمت مضبوط باندھتے ہیں مگر تمام جد و جہد
کے بعد اور کمال سعی و کوشش کے بعد صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ
کو تنکے نے ٹکر دی۔ جب وہ ذات جلیل القدر موجود تھی تو دنیا اُس کے
سامنے دشمن بنکر آئی اور اب وہ جب زیر خاک شفا عاشور سا سخت
مرحلۂ امتحان جھیلے ہوئے آرام میں ہے جب بھی دنیا اُسکی عداوت سے
غافل نہیں۔ اگر وہ نہیں تو اُسکا ماتم ہی سہی۔ بہرحال حملہ ضروری ہے
چاہے وہ کامیاب ہو یا ناکامیاب۔ روکنے والوں کو سنبھلنا چاہیے

ان آنسوؤں نے اپنی کمزور روانی سے زور دار سلطنتیں بہادیں اور جباروں کے تخت چھین لئے۔ اُمڈے ہوئے دل بند باندھنے سے نہیں رکتے اور وہ قلب جو اپنی آنچ میں آپ پگھل رہے ہیں وہ لغو مواعظ سننے کیلئے تیار نہیں۔

پھر نہ معلوم ہوا کہ وہ کون ہے؟

جس نے پیغمبرؐ کو پہچان لیا ہے وہ اُسے بھی پہچانتا ہے بلکہ یوں کہوں گا کہ جو خدا سے واقف ہے وہ اُس سے ناواقف نہیں۔ اُس کا لہو کس کی راہ میں سبیل ہو گیا۔ قتل ہو جانے سے اُسکی غرض کیا تھی؟ دولت کے طالب دولت اس لیے طلب کرتے ہیں کہ وہ زندہ رہ کر اس سے فائدہ اُٹھائیں لیکن مرنے والے پر طلبِ دنیا کا دعویٰ نہیں لگایا جا سکتا یا اسلئے دنیا طلب کیجاتی ہے کہ میرے بعد میری اولاد اچھی طرح بسر کر سکے گی! ہاں یہ سچ ہے لیکن اس شخص کے متعلق یہ احتمال نہیں ہو سکتا جو شیر خوار اور نوجوان سے اپنی زندگی میں دست بردار ہو چکا ہو۔ اچھا یہ بھی ممکن ہے کہ قرابت داروں کے کام آنے کے لئے سعی کی جائے لیکن یہاں یہ تو ہم بھی نہیں ہو سکتا ورنہ مدینہ برباد نہ ہوتا اور کربلا آباد نہ ہوتی۔ خاصانِ خدا کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جب انھیں اس ہمت بلند کا تصور ہوتا ہے جس کے سامنے گردن کی رگوں کا کٹنا آسان معلوم

ہوتا تھا اور تعلقات باری کا قطع ہونا مشکل بلکہ محال نظر آتا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا دین و شرع کے لئے ہوا۔ خدا و رسول کے لئے ہوا، ایمان والوں کے سر پر قیامت تک کیلئے وہ احسان چھوڑا ہے جو آج سے لیکر نفخ صور تک ادا نہیں ہو سکتا۔ اہل عقل آثار و علامات سے حقائق کا پتہ لگا لیتے ہیں کیا ان صفات سے بھی شناخت مشکل ہے بیشک دستور ہے کہ سر ہی سے انسان کی شناخت ہوتی ہے لیکن ہم وہ نہیں ہیں کہ اپنے بے سر سردار کو نہ پہچانیں۔ اُسکے ہر جزو بدن سے نور الٰہی کی لو اُٹھ رہی ہے جو بصیرت دل سے مخفی نہیں ہو سکتا۔

بروی دوست نکردم نظر کہ تاب نبود
بنور باری اعضا شناختم اورا

اچھا ہم سمجھ گئے

(لکاتبہ)

این است حسین کہ خدا ساز نمود
درہائے جناں بر اہل دیں باز نمود

اسلام چو ختم شد بسبب دنیا
سر داد و زختم باز آغاز نمود

آپ کا فارسی طرز انشا بھی بہت دلآویز تھا۔ فارسی جملوں کے ساتھ عربی فقرات کی ترصیع اور اسمیں مناسب اقتباسات یہ تقریباً آپ کی ایجاد تھا مدرسہ ناظمیہ میں اکثر اکابر کی فاتحہ خوانی وغیرہ کے موقع پر طلاب آپ ہی سے

جا کر عبارت لکھواتے تھے اور آپ اسی رنگ میں تحریر فرماتے تھے۔

ہماری نظر سے آپ کی ایسی بہت سی تحریریں گذری ہیں مگر افسوس کہ محفوظ اسوقت کوئی نہیں۔

مرحوم کے برادر عزیز القدر ابو البراعة مولانا سید ظفر مہدی صاحب گہر مدیر سہیل یمن ادام اللہ بقاءہٗ جو بہت حد تک مولائے مرحوم کے ادبی کمالات کے حامل اور یادگار ہیں انھوں نے مولانا مرحوم کے جہلم کی مجلس کا رقعہ بالکل اسی انداز میں تحریر فرمایا ہے اسلئے ناظرین کو اس انداز تحریر سے روشناس کرانے کے لئے ہم اس رقعہ کا اقتباس درج کرتے ہیں :-

"شب دیجور غم از افق ہم سر زدہ، آفتابم کو؟ والشمس تجری لمستقر لہا، مہر ابتلا از مشرق مشیت سر بر زدہ سحابم کو؟ یا منشی السحاب الثقال، یعقوب دیدہ ام نمی دارد کہ سیل فنا را آب دہد ایوب المم غمی دارد کہ زلف بلا را تاب دہد، کسوف شمس علمم بہ ستارہ بادی چشمم زاہر، انا صببنا الماء صبا و از شگاف خامہ کن از تل دو نیم ظاہر، ثم شققنا الارض شقا، کشت امیدم زعفران زار است کہ خضر طریقم نماندہ تا راہ مصطفےٰ، و وادی ایمن جگرم پر نار است کہ شقیقم نماندہ دہ برق از غم جہاں ماندہ الی الحت نازل و ستم بر دل است کہ صاعقۂ عاطفت فوت بازو ہم از سرم برفت وا اسفاہ و پایم در گل است

کہ بار گرانم قائم گرفت انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ از بار غمش شکیبائی
من بخت سفر بربست و خار غمش بدل مجروحم بنوک نشتر شکست، خطیب
آل محمد صلعم کو گوئی مردۂ فصاحت و بلاغت را جان دہد انا الی ربنا منقلبون
و کلیم اہلبیت کجا؟ کہ طور دل را از برق بیانش تکان دہد و فبای حدیث
بعدہ یومنون ایجاز و اطناب بیانش در جزر و مد کلامش، روح فصاحت
و بلاغت و نمایند و اعجاز لسانش قصور سحر باطل را کاعجاز نخل خاویۃ
گردانید فالقی السحرۃ سجدا خطیبے کہ بدل از غم فراقش شق نمود فانفجرت منہ اثنتا
عشرۃ عینا ادیبے کہ زور بیانش امتیاز باطل وحق نمودہ نقذف بالحق
علی الباطل نمائے کہ بجوارہ علم ذکر اہلبیت برافراشتہ و مدح آل بر لب فیدمغہ
اکنون غمش می بالد و زمانہ می نالد، آہ کہ فصاحت را عقبہ نماند و بلاغت
را عقبہ نماند علم را شعبہ نماند و بیان را کعبہ نماند، کنعان دل از یوسف
غمش آباد و یثرب وطن از جور حلقش برباد آمد"

رفت آنچہ رفت بادیدم اکنون نگاہ شست — از بہر لوز دیدۂ زہرا گریستن

نامہ و پیام میں آپ کی عبارت سادہ اور بے تصنع ہوتی تھی لیکن اکثر جا بجا
عربی فقروں کا استعمال پر لطف ہوتا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ جب آپ زہر کی تکلیف میں مبتلا ہوئے ہیں اور ایک خاص
بزرگ کی نسبت خیال قائم ہوا ہے کہ انھوں نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہو

جناب نجم الملتہ مدظلہ کے یہاں کی کسی مجلس میں سالانہ خوانندگی اُن بزرگ سے متعلق تھی
اور جناب معظمہ یعنی اہلبیت جناب نجم الملتہ کو اُن بزرگ کا پڑھنا بہت زیادہ پسند
اور اُن کا اصرار کہ وہی صاحب پڑھیں۔ جناب نجم الملتہ مدظلہ کو یہ خیال کہ انکا
پڑھوانا مولوی سبط حسن صاحب کے خلاف مزاج ہوگا۔

آخر اس کشمکش میں جناب نجم الملتہ نے مولانا مرحوم کو خط لکھا اور اس میں
اصرار مذکور کے تذکرہ کے ساتھ اُن کے پڑھوانے کی نسبت مولانا کا منشا دریافت کیا۔
مولانا نے جواب میں بس یہ آیت لکھ بھیجی۔

یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین

اسمیں جو جو لطافتیں ہیں وہ ارباب معنی خوب سمجھ سکتے ہیں۔

تصنیفات مولانا مرحوم نے باوجودیکہ اپنی زندگی کے لئے شعبۂ تقریر کو خاص
طور سے اختیار کر لیا تھا اور اُن کو مجالس کی خوانندگی اور اسکے
مطالعہ ہی سے فراغت نہ تھی لیکن باوجود اسکے اُنھوں نے تصنیف و تالیف کا
مشغلہ بھی برابر قائم رکھا اور لکھتے رہے چنانچہ انکی تصنیفات جو ہماری نظر سے گذرے ہیں حسب ذیل ہیں

(۱) تقویم الاود مداواۃ العمد۔ یہ عربی زبان کی کتاب ہے جو
بہت ادبی خصوصیتوں کی حامل ہے اور طبع ہو چکی ہے۔

(۲) ہدم الاساس باثبات حدیث القرطاس۔ مرزا حیرت دہلوی کا جواب ہے
کہ اُنھوں نے مثل واقعہ کربلا کے حدیث قرطاس کی واقعیت سے انکار کیا تھا۔

(۳) خطاب فاصل اُردو ترجمہ میزان عادل۔ یہ علامہ سید رضا ہندی نجفی کی کتاب میزان عادل کا جس میں اصول دین تشریح کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ترجمہ ہے۔ درحقیقت چونکہ مولانا فن ترجمہ میں خاص طور سے شہرت رکھتے تھے اسلئے مدرسۃ الواعظین سے اکثر کتابوں کے متعلق جن کی ضرورت محسوس ہوتی تھی آپ سے فرمائش کی جاتی تھی کہ ترجمہ کر دیجئے اور آپ اس فرمائش کو پورا فرما دیتے تھے

(۴) مسالک الحکما، اُردو ترجمہ مناہج الحکماء یہ ادیان کی رد میں ہے۔

(۵) سچا موتی یعنی اُردو ترجمہ رسالہ در ثمین تصنیف علامہ سید محسن شامی عاملی یہ بھی اصول دین میں ہے۔

(۶) حجر دامغ معروف بہ عذاب واقع۔ یا "حدیث غدیر کی سرگذشت" یہ حدیث غدیر کے متعلق ایک مبسوط اور پر از معلومات کتاب ہے اسکے علاوہ "سہیل یمن" میں ایک مرتبہ اعلان ہوا تھا کہ "سوانحعمری خلیفہ ثانی" آپکے مؤلفات سے بالکل تیار ہے لیکن اسکے بعد اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

"الکاظم" سوانحعمری امام ہفتم موسیٰ کاظم علیہ السلام نواب علی جواد خاں صاحب رئیس کے تصنیفات سے ہے جس پر مصحح کی حیثیت سے جناب مولانا کا نام ہے لیکن اس تصحیح میں اتنا حصہ مولانا کے قلم کا ہو گیا ہے کہ اسکے ضمن میں ایک مستقل تصنیف مولانا کی ہو گئی ہے۔ اس میں امہات ائمہ معصومین ؑ کے نسب کا باب خاص طور پر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

"سہیل یمن" کا معرکۃ القلم بہت حد تک آپکے جہاد بالقلم کا نتیجہ رہا کیا جو اگر مجتمع کیا جائے تو ایک مبسوط تالیف ہوگی۔

تحفۂ اثنا عشریہ کے مکمل جواب لکھنے کا ارادہ بھی آپنے کیا تھا اس کا اعلان بھی سہیل یمن میں ہوا لیکن شاید پایۂ تکمیل کو نہ پہونچا۔

"رفعہ مجلس امام انام" جو نواب جناب حسین خان عشر بابو صفا دستی اسٹیشن لکھنؤ) کے یہاں سے شایع ہوتا ہے اسمیں کئی سال تک آپکے قلم سے ایک مضمون واقعہ کربلا کے متعلق نکلا ہے جو بہت پر از معلومات ہے۔

"الواعظ" میں ایک عرصہ تک آپ کا نام بحیثیت ادارت زیب برہا رہا لیکن وہ فقط جناب نجم الملۃ ظلہ کے حکم کی تعمیل تھی۔ آپنے اس میں کوئی عملی حصہ لیا ہو ایسا نہیں۔ آپ کے شاید اس زمانہ میں دو یا تین مختصر مضمون الواعظ میں نکلے تھے اور بس۔

جس زمانہ میں جناب مولوی حکیم مقبول احمد صاحب مرحوم سے آپ سے اختلاف پیدا ہوا ہے۔ کوٹھی نو تعمیر تھی" یہ جگہ مولانا نے "معہد علمی" کے طور پر قرار دی تھی کہ یہاں تصنیف و تالیف کا کام انجام پائے۔

مولوی مقبول احمد صاحب مرحوم کا "ترجمۂ قرآن" زیر نظر تھا" اس ترجمہ کی صدہا غلطیاں نکالی گئیں۔ اسکے بعد مولانا نے ارادہ فرمالیا کہ خود قرآن مجید کا صحیح ترجمہ تحریر فرمائیں۔ اسکے لئے تمام اردو فارسی تراجم جمع کئے گئے

اُن سب کو پیش نظر رکھ کر اُن پر بحث و تمحیص ہوتی کہ کون ترجمہ بہتر ہے بہترین ترجمہ منتخب کر کے پھر اُس پر غور ہوتا کہ اُس میں کوئی خرابی تو نہیں ہے اور پھر خود اُس سے بہتر ترجمہ کی فکر ہوتی کہ اس سے بہتر ممکن ہے یا نہیں اس طرح پارہ دو پارہ کا ترجمہ کیا گیا۔ کیا کہنا۔ مولانا مولوی سبط حسن صاحب قبلہ کے ایسے قلم سے اور پھر اتنی کاوش کے بعد جو ترجمہ ہو وہ کیسا ہوگا۔ یقیناً اگر وہ ترجمہ مکمل ہو جاتا تو دنیائے اسلام میں ایک یادگار چیز ہوتا لیکن اسکے بعد مولانا مقبول احمد صاحب مرحوم سے مصالحت ہو گئی اور وہ ارادہ بھی ملتوی ہو گیا۔

کتبخانہ مرحوم کو کتابوں کا خاص شوق تھا۔ ہزاروں روپے صرف کئے اور بڑی بڑی دور سے کتابیں منگوائیں۔ خود عراق کے چند سفر کئے اور ہر مرتبہ کتابیں اپنے ساتھ لائے خصوصیت کے ساتھ قلمی کتابیں اور پھر خصوصیت سے قدیم نسخ صحیفۂ کاملہ کا انھیں بہت شوق تھا۔ جہاں کوئی عمدہ نسخہ صحیفۂ کاملہ کا انھیں ملتا فوراً خرید لیتے اس طرح کئی ہزار کی تعداد میں کتابیں جمع ہو گئیں جو ایک گرانقدر علمی خزانہ ہے۔

طالبعلمی میں بلکہ اُسکے بعد بھی اکثر قلمی کتابیں جو دستیاب نہ ہوسکتیں اور کہیں سے عاریت ملجاتیں خود انھیں اپنے قلم سے نقل کر لیتے تھے چنانچہ کتاب اوراق الذہب حالات جناب سید العلماء علیین مکان طاب ثراہ

مصنفۂ جناب علامہ مفتی میر عباس صاحب علی اللہ مقامہٗ ہماری نظر سے آپ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی گذری اور اسی طرح کتاب سرار الرغاب فی مسألۃ الحجاب جو آپ کے استاد علامہ جناب مولانا سید باقر صاحب علی اللہ مقامہٗ کی تصنیف تھی اسے بھی آپ نے نقل کیا۔

خوشنویسی

آپ کا خط بہت عمدہ، جاذب نظر اور دلکش تھا۔ نسخ اور نستعلیق دونوں تحریر فرماتے تھے اور بہت خوب۔ کتابوں کے لکھنے میں اہتمام ملحوظ رکھتے تھے یعنی کتاب کے عناوین کو سرخ روشنائی سے جلی لکھنے کے قابل سرخیوں کو جلی حرفوں میں اور اسی صورت سے تمام خصوصیات کتابت کو مدنظر رکھتے تھے۔ ہم نے سنا ہے کہ آپ نے ایک نسخہ قرآن مجید کا بھی اپنے قلم سے لکھا تھا یا لکھنا شروع کیا تھا لیکن یہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔

حسن محاضرہ

آپ کی روزمرہ کی گفتگو جو تمام صحبتوں میں ہوتی تھی وہ بھی انتہائی دلآویز و دلچسپ تھی۔ آپ کے پاس بیٹھکر اٹھنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ لطیف برجستہ فقرات، چبھتے ہوئے جملے ظرافت آمیز لیکن شائستہ و سنجیدہ الفاظ۔

یہ اسوقت کے تذکرے ہیں جب امراض نے آپ کو زندگی ہی میں مردہ دل نہ بنا دیا تھا۔ آپ کی صحبت میں بیٹھ کر زندہ دلی کے معنی معلوم ہونے تھے اور انسان کتنا ہی مردہ دل ہو لیکن اس میں بھی زندگی کی

روح دوڑ جاتی تھی۔

اخلاق و اوصاف

مزاج میں سادگی تھی۔ لباس و آرائش کی طرف مطلق توجہ نہ تھی جو ملا پہن لیا۔ کہیں سے لباس پھٹا ہو، کوئی دھبا ہو بغیر توجہ دلائے ہوئے انھیں اسکی کوئی فکر نہ ہوتی تھی۔ اپنے اُس عظمت و اقتدار کے دور میں وہ صرف پرانی کتابوں کی فکر میں اکثر نخاس تک چلے جایا کرتے تھے اور اسے اپنے لیے کوئی عار نہ سمجھتے تھے۔ ہر ایک سے جھک کر ملتے تھے۔ طرز گفتگو اور عنوان معاشرت میں تکبّر و انانیت کا نشان تک نہ تھا طبیعت صاف تھی جس سے ملتے تھے صفائی کے ساتھ ملتے تھے غصّہ آتا تو بڑے سے بڑے شخص کی پرواہ نہ کرتے تھے اور ذرا سی بات میں غصّہ فرو ہو جاتا تھا تو شیر و شکر ہو جاتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرتے تھے۔ بہت سے اشخاص کے کام نکلتے رہتے تھے اور خبر گیری ہوتی تھی۔ مالی معاملات میں تنگ نظری سے کام نہ لیتے تھے۔ اکثر لوگ کم قیمت کی چیزیں انکے ہاتھ زیادہ قیمت کو فروخت کر ڈالتے تھے اور وہ لے لیتے تھے۔ بہت سے لوگ اُن کی سادگی سے فائدہ اُٹھا کر اپنے منافع اُن سے حاصل کرتے تھے اور وہ توجہ ہو جانے پر بھی چشم پوشی سے کام لیتے تھے۔ غرض ؎

بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

دنیا عرصہ تک اُن کی یاد میں بےچین رہے گی اور وہ آغوش قبر میں اب

چین سے مصروف آرام ہیں۔

زیارت عتبات عالیات

مولانا مرحوم نے چند مرتبہ عتبات عالیات کی زیارت کا شرف حاصل کیا اُن کے پیش نظر بہت سی وہ حدیثیں تھیں جن سے بظاہر زیارت سید الشہداء کے وجوب کا پتہ چلتا ہے اور تیسرے چوتھے برس کم از کم جانیکا حکم نکلتا ہے۔

چنانچہ چند سال اُس طرف عتبات عالیات سے اپنی واپسی کے بعد آپنے افضل محل میں رانی شہنشاہ بیگم صاحبہ کے یہاں کی مجلس میں بڑی تفصیل سے اُن احادیث کو بیان فرمایا تھا جن سے زیارت کے حکم وجوبی کا پتہ لگتا ہے۔

آپنے مشہد مقدس امام رضا علیہ السلام کی زیارت بھی کی اور عتبات عالیات کی زیارت کو تو آخری مرتبہ سال گذشتہ اس عالم میں گئے جبکہ مرض نے آپ کو کافی نحیف و مضمحل اور آپکے قویٰ کو معطل کر دیا تھا۔

دنیاوی ترقی

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آپنے اپنے شعبہ میں دنیاوی ترقی جتنی حاصل کی اتنی کسی دوسرے شخص کو نصیب نہیں ہوئی۔

اُن کے زمانہ ترقی میں اُن کی آمدنی کا صحیح اندازہ مشکل ہے بہر حال وہ اُس زمانہ میں متمول افراد میں محسوب ہوتے تھے اور اگر اُن کے مصارف بھی اُسی مناسبت سے بہت وسیع نہ ہوتے تو وہ اپنے بعد ایک بہت بڑی جائداد

اور غیر معمولی دولت اپنے پسماندگان کیلئے ذخیرہ چھوڑ جاتے۔

خطاب شمس العلماء ۱۹۲۵ء میں گورنمنٹ برطانیہ نے مولانا مرحوم کی عالمگیر شہرت و رسوخ اور مسلم الثبوت قابلیت و استعداد کا احساس کرتے ہوئے شمس العلماء کا خطاب دیا جو مرحوم کے ذاتی مراتب و اوصاف کے لحاظ سے کوئی اہم حیثیت نہیں رکھتا۔

خدمات دینی آپنے اپنی تمام عمر ہی خدمت دین میں گذاری۔ اُن کا بیان جس کے متعلق کافی تبصرہ کرنے کا محل اب بہت قریب آ گیا ہے وہ تمام احیائے ملت حقہ اور تبلیغ مذہب جعفری کا حامل تھا جس کے ذیل میں تفسیر، کلام۔ احتجاج۔ مناظرہ سب ہی طرح کے فرائض پورے ہوتے تھے۔

پھر اسکے علاوہ آپنے تحریر سے بھی برابر نصرت مذہب کی چنانچہ آپکے تصانیف اور بعض مذہبی مضامین کا تذکرہ اسکے قبل کیا جا چکا۔ تدریس کے شعبہ میں بھی عمر کا کافی حصہ صرف کیا۔ مدرسہ ناظمیہ اور مدرسۃ الواعظین میں بہت سے افاضل آپ سے کسب فیض کرتے رہے اور علوم دینیہ کی آپ سے تعلیم حاصل کی۔

مناظرہ آپنے عام طور سے مناظرہ کو اپنا پیشہ نہیں قرار دیا تھا بلکہ وہ اتحاد و اتفاق بین المسلمین کے حامی تھے جیساکہ اُن کی آن

تقریروں سے ظاہر ہے جو انھوں نے امام باڑہ آصفی یا رفاہ عام کے مشترک اسلامی جلسوں میں کی ہیں لیکن جب نصرت و حمایت مذہب کیلئے ضرورت پڑی تو انھوں نے اس میدان میں بھی فاتحانہ قدم رکھا اور حقانیت کی فتح و ظفر کا علم بلند کیا۔

وہ امروہہ کا مناظرہ ہے جو یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ اُدھر سے بڑے بڑے عالم مدعو تھے جن میں سے مدیر النجم مولوی عبدالشکور صاحب مناظر مقرر ہوئے۔

ادھر سے بھی حضرات مومنین نے بہت سے افراد کو دعوت دی تھی۔ مولوی حکیم مقبول احمد صاحب جناب مولانا محمد رضا صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ اور متعدد حضرات تشریف فرما تھے لیکن اُن میں سے مناظرہ کیلئے جناب مولانا سبط حسن صاحب قبلہ ہی منتخب ہوئے۔

مقابلہ ذرا بے زیب تھا اسلئے کہ مولوی عبدالشکور صاحب سے مولانا کے شاگرد رشید جناب مولوی محمد سجاد صاحب مناظر بارہا مقابلہ کر چکے اور شکست دے چکے تھے پھر مولانا سبط حسن صاحب کا ان کے سامنے آنا کیسا لیکن چونکہ احقاق حق کا محل تھا اور اس موقع پر انکار کرنا دعوت دینے والوں کی دلشکنی نیز فریق مخالف کی ہمت افزائی کا باعث ہوتا اسلئے مولانا تیار ہو گئے اس مناظرہ کی مکمل روداد غالباً امروہہ میں چھپ کر شائع ہو گئی ہے

جو اسوقت ہمارے پیش نظر نہیں۔

پہلے دن مناظرہ ہوا اور اُس دن نقطۂ کلام "تحریف قرآن کے اہلسنت کے کتب سے اثبات" پر منتہی ہوا۔

مولانا مرحوم نے شب بھر کتابوں کی جستجو کی اور صبح کو ایک بڑا ذخیرہ کتابوں کا تھا جو آپکے ساتھ لیجاکر میز پر رکھدیا گیا۔

آپ کی تقریر شروع ہوئی۔ مولانا محمد رضا صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہٗ جو دوسرے دن صبح کے مناظرہ کے بعد وہاں سے واپس تشریف لائے تھے اُن سے اسی موقع پر حالات دریافت کیے گئے تو ہم کو موصوف کی زبان کا یہ فقرہ خود اسوقت تک یاد ہے کہ اُنھوں نے بیان واقعات میں فرمایا آج جو مولوی سبط حسن صاحب نے تقریر شروع کی تو ایسی دلکش اور جاذب قلوب تھی کہ موافق اور مخالف شیعہ اور سنی پورے مجمع پر محویت کا عالم طاری تھا کان علی رؤسھم الطیر (گویا سر پر طائر بیٹھا ہوا ہی) یہ فقرہ خاص مولانا محمد رضا مرحوم کے دہن سے نکلا ہوا ہے جس میں مبالغہ کی آمیزش نہیں سمجھی جا سکتی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہی روز کے بعد تیسرے دن امروہہ کے حدود (ساختۂ النجم) امام اہلسنت کے وجود سے خالی تھے، اور وقت مناظرہ پر پنڈال میں فاتح مجاہد اسلام مولانا سبط حسن صاحب قبلہ اور آپکے مجمع کے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا۔

مولانا سبط حسن صاحب نے ابرہہ ابھی چھوڑا نہیں تھا کہ لکھنؤ میں مجسمۂ غیرت مولوی عبدالشکور صاحب کی طرف سے اپنی فتح کا اشتہار شایع کر دیا گیا جس کا جواب مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کے ورود لکھنؤ کے موقع پر فوراً نکلا۔

"چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

یہ اشتہار اور اسکے بعد کا سلسلہ بہترین ادبی خصوصیات کا حامل تھا جو معلوم نہیں کہیں محفوظ ہے یا نہیں۔

یہ سلسلہ اشتہار بازی کا بہت دن تک جاری رہا۔

ادھر سے ایسی ایسی چبھتی ہوئی سرخیوں سے اشتہار نکلے "تیر شہاب" "مشت بعد از جنگ" وغیرہ وغیرہ۔

جس کے جواب میں فریق مخالف کی ادبی بے مایگی عجز کا اظہار کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ دہن جواب میں قفل پڑے اور ابرہہ کا فاتح معرکہ میدان تحریر میں بھی فاتح نظر آنے لگا۔

فن خطابت
یا
ذاکری

تذکرہ اپنے حدود سے آگے بڑھ گیا ہے اور اب سلسلۂ بیان وہاں پہونچا ہے جو جان مقصد ہے اور جس کے لئے اس مضمون کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔

مولانا سبط حسن صاحب حقیقۃً خطابت کیلئے خلق ہوئے تھے اور خطابت اُن کے لئے۔ منبر انکی زینت تھا اور وہ منبر کی زیب۔

فن ذاکری اگر پہلے سے آسمان تھا تو انھوں نے عرش اعظم بنا دیا اور ستارہ تھا تو انھوں نے آفتاب عالمتاب سے آگے بڑھا دیا۔

میں نہیں کہتا، دشمن اسکے مقر تھے اور مخالفین مذہب کے دلوں پر اُنکے حسن تقریر کا سکہ بیٹھا تھا۔

پہلے سب سے یہ دیکھو کہ اُن میں تمام وہ باتیں قدرت نے جمع کردی تھیں جو ایک خطیب، واعظ، ذاکر کیلئے ضروری ہیں۔

اُن کا جسم بھاری بھر کم تھا جو منبر پر رونق دیتا تھا اور آنکھوں کو سبک نہ معلوم ہوتا تھا۔ اُنکی آواز بڑی لیکن توازن رکھنے والی اور خوش آیند تھی

جو تمام مجمع تک پہونچتی لیکن قریب کے کان کو بھی بری نہ معلوم ہوتی تھی، اُنکی شکل وجیہہ تھی جو دیکھنے والوں کی آنکھوں کو اچھی بھی معلوم ہوتی تھی اور دلوں پر وزن ڈالتی تھی۔

اُن کے ہاتھ پورے توازن کے ساتھ حرکت کرتے تھے اور موقع کے ساتھ ادائے مطالب کے لئے جنبش میں آتے تھے۔ اُنکی رفتار تقریر نہ بہت تیز تھی جو ذہن کو تمام خصوصیات کلام پر متوجہ نہ ہونے دے اور نہ ایسی سست کہ طبیعتوں کے اکتانے کا باعث ہوجائے۔

اُن کو الفاظ کے صرف کا ملکہ تھا، عربی سے اُردو کے ترجمہ کرنے میں کمال تھا اور ترتیب مطالب کا بہترین سلیقہ تھا۔

استعداد علمی تھی جو مضامین میں وزن وشائستگی پیدا کرے اور ادبی ذوق تھا جو اُن میں لطافت کی روح پھونکدے اور شاعرانہ طبیعت تھی جو اُن میں ندرت وجدت کا جوہر ودیعت کرے۔

ذکر مصائب میں جذبۂ حقیقی تھا جو الفاظ کو بھی پُر درد بنائے اور جوش قلبی تھا جو اُن میں زور پیدا کرے اور رقت قلبی تھی جو اُن میں سخت پہلو آنے نہ دے اور پھر مصائب کے بیان میں اُن پر خود گریہ کا غلبہ ہوتا تھا جو دوسروں پر اثر ڈالے لیکن وہ جوش گریہ نہ اُنکی آواز کو خراب کرتا اور نہ ان کے ہوش وحواس کی پریشانی کا باعث ہوتا تھا۔

یہ بہت ظاہری پہلو ہیں جو قدرت نے بحیثیت خطیب کے اُن میں ودیعت کئے تھے اور اُن کے بیان کے اصلی خصوصیات وہ اس قدر ہیں کہ قلم اُن کے پورے شرح و بسط سے عاجز ہے صرف بعض پہلو اسکے بحد امکان صفحۂ قرطاس کی نذر کئے جاتے ہیں۔

وضع الفاظ و محاورات

انھیں الفاظ کے صرف کرنے کا ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ جو لفظ جہاں رکھدی معلوم ہوتا تھا واضع نے یہیں کے لئے وضع کی ہے، بندش الفاظ کی چستی الفاظ میں وہ روح دوڑا دیتی تھی کہ شاید و باید۔

اس سب کے علاوہ جس خاص چیز کی طرف میں توجہ دلانا چاہ رہا ہوں اور جسکی بنا پر انھیں زبان اُردو کا ایک مجدد ماننا پڑتا ہے وہ یہ کہ انھوں نے الفاظ و محاورات کی ایک دنیا پیدا کر دی جو آج ہمارے مقررین کی زبانوں پر بلا تکلف جاری ہے اور اسکی طرف بہت کم لوگ متوجہ ہیں کہ اسکی بنیاد صرف اور یقیناً صرف مولانا سبط حسن صاحب کی ذات سے قائم ہوئی ہے۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں اس قسم کے تمام الفاظ کا صحیح احاطہ کرسکتا ہوں اور بتلا سکتا ہوں۔ لیکن مثال کے طور پر چند الفاظ و محاورات پیش کرتا ہوں اور اُن سے ناظرین میرے بیان کی صحت کا اندازہ کرینگے

اللہ سبحانہ اور خداوند عالم کے بجائے جناب باری حضرت احدیت

۶۔ اسمہ۔ ربّ العزت، خلاق عالم اور اس کے علاوہ "قدرت" کی لفظ

مثلاً "خداوند عالم نے یہ انتظام کیا" اسکے بجائے یہ کہ "قدرت کی طرف

سے یہ انتظام ہوا"

"خدا کو یہ منظور نہ تھا" اسکے بجائے "قدرت کو یہ منظور نہ تھا"

وغیرہ وغیرہ۔

غالباً نہیں یقیناً یہ مولوی سبط حسن صاحب کا حصہ ہے اور اب

وہ ہماری زبانوں پہ مثل ایک اصلی اردو زبان کے لفظ کے جاری ہے۔

رسولؐ اللہ اور رسالتمآبؐ کے بجائے اختصار کے موقع پر رسولؐ

پیغمبرؐ۔ اسکے ساتھ جب بیساختگی کے موقع پر وہ لفظ میں وحدت پیدا

کردیتے تھے تو اُن کے منہ سے بہت اچھا معلوم ہوتا تھا اگرچہ تاہم سننے

والوں نے اکثر اعتراض کیا کہ وہ عظمت ملحوظ نہیں رکھتے مگر انھیں کیا

معلوم کہ یہی "تو" کبھی جانِ عظمت بنجاتا ہے۔ مثلاً جنگ احد کے موقع پر

وہ یوں کہتے تھے۔

"پیغمبرؐ آواز دے رہا تھا کہ میں زندہ ہوں کہاں جاتے ہو لیکن کوئی

مڑکر نہ دیکھتا تھا" یا آیۂ مودّت کی نسبت وہ یہ کہتے۔

"رسولؐ کہہ رہا تھا کہ میرا اجر سوائے محبت کے کچھ نہیں مگر امت نے

توجہ نہ کی"

قرآن مجید کیلئے :- "کتاب محکم" "کلام بلاغت نظام"

حضار مجلس کیلئے :- "اہل بزم" "ارباب مجلس"

جہانتک میں نے سنا اُنھوں نے "عزادارو" یا عزاداران حسینؑ"

کہکر کبھی مخاطب نہیں کیا۔

قال اللہ اور قال الرسولؐ کے ترجمہ میں "فرمایا خداوند عالم نے" یا فرمایا جناب رسالتمآبؐ نے" اسکے بجائے بطور اختصار "ارشاد ہوتا ہے" یا "ارشاد ہو رہا ہے"

دنیا کے لئے "صحن عالم" یہ چیز تو اُن کی زبان پر آتے ہی اتنی عام ہوئی اور نقالی کرنے والوں نے "صحن عالم" اتنا کہنا شروع کردیا کہ اُنھوں نے آخر میں بالکل چھوڑ دیا تھا اور اب اُن کی زبان پر یہ لفظ بہت کم آتا تھا۔

"شخص" اور "ذات" کے بجائے "ہستی" مثلاً "وہ محترم ہستی" "وہ بزرگ مرتبہ ہستی" اُنکی تقریر میں قدم قدم پہ استعارات وکنایات ہوتے تھے اور اُنہی کے اوپر بندش الفاظ کی بنیاد قائم ہوتی تھی۔

اُن کے دہن سے نکلی ہوئی یہ دو لفظیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں اور طبیعت اُن کی بلاغت سے لطف اُٹھا رہی ہے :-

"گریبان ازل سے دامان ابد تک"

کسی کا ذہن کہاں جاتا ہے کہ ازل کے لیے گریبان کی نسبت دینا چاہیے

اور ابد کیلئے داماں کی جیب تک معانی و بیان کے جوہر طبیعت میں راسخ ہو گئے ہوں اور کلام حسن تخیل کے سانچہ میں ڈھل کر نہ نکلتا ہو۔

اُن کے لئے یہ الفاظ بالکل معمولی حیثیت رکھتے تھے یعنی اُن کو ان الفاظ کی تلاش میں کوئی فکر و غور کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ مسودہ لکھتے تھے مگر وہ عربی عبارتیں اور عربی ہی میں نوٹ ہوتے تھے جنھیں کتاب پر قلمبند کر لیتے تھے۔

یہ الفاظ تو سلسلۂ کلام میں بے ساختہ اُنکی زبان پہ جاری ہوتے تھے اور انھیں شاید خود ان الفاظ کی کوئی اہمیت بھی معلوم نہ ہوتی ہوگی۔

لطف تقریر علاوہ نکات اور مطالب کے لطف کے جس کا تذکرہ آئیندہ آئیگا اصل حسن بیان اور لطف تقریر اُن کا ایسا تھا جو قدرت نے اُنہی کے ساتھ مخصوص قرار دیا تھا تمثیل اور محاکات ان کے بیان میں اتنے حد کمال پر ہوتی تھی کہ جس چیز کو بیان کرتے تھے اُسکی تصویر کھینچ دیتے تھے، رات کا منظر اگر بیان کیا تو معلوم ہوا حقیقتہً تاروں بھری رات موجود ہے اور بارش کا ذکر کیا تو خیال ہوا کہ جھما جھم مینھ اسی وقت برس رہا ہے۔ جنگ کے تذکرہ میں تلواروں کی جھنکار کی آواز کانوں میں اور خون کی بارش کا سماں نظروں میں پھر نے لگتا تھا۔

وہ جس چیز کو بیان کرتے تھے سحر بیان کرتے تھے اور اتنی آراستگی

پیدا کر دیتے تھے کہ حقیقت کے مشاہدہ سے وہ لطف نہیں آسکتا جو اُن کے بیان سے آتا۔

جب وہ بیان شروع کرتے تھے تو چاہے وہ کوئی مطالب بھی بیان کریں اور کوئی نکتہ ذکر نہ کریں لیکن صرف الفاظ کی ادا اور عبارت کی آرائش پر دل کھنچا تھا اور طبیعت وجد کرتی تھی۔

اُن کا بیان ادہر شروع ہوا اور اُن کی ہر لفظ پر دل نے واہ کہا اور طبیعت نے سبحان اللہ مجمع پر وجد کا عالم طاری ہوتا تھا ہر شخص محو ہو جاتا تھا۔

وہ لوگ جو اُن کے مقابلہ میں جناب مولانا محمد رضا صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے بیان کو ترجیح دیتے تھے کہ وہاں مطالب علمیہ ہوتے ہیں اور دوسری لفظوں میں کبھی یہ کہتے تھے کہ وہاں سے اُٹھتے ہیں تو کچھ ذہن میں لیکر اُٹھتے ہیں لیکن مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بیان میں کچھ ہم کہہ ہی نہیں سکتے کہ اُنھوں نے کیا بیان کیا ہے یہ لوگ خود بعد کو یہ سب باتیں بنا لیتے لیکن جب تک مولانا سبط حسن صاحب کی محفل میں رہتے اُنھیں بھی عالم محویت میں ہونا اور زبان سے واہ کا نکلنا ضروری تھا۔ وہ سحر تھا۔ طلسم تھا، نہیں بلکہ اعجاز تھا جس کی حقیقت لفظوں سے ادا نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی انتہائی کوشش سے اُس کو حاصل کر سکتا ہے۔ وہ خدا کی دی ہوئی چیز تھی اور اسی کے عطا کرنے سے نصیب ہو سکتی ہے۔

وہ جس دن پہلے سے مطالعہ کا موقع نہ ملتا اور کسی مجلس کے لئے تیار نہ ہو سکتے
اُس دن پوری مجلس کو الفاظ پر رکھ لیتے تھے اور اُنہی الفاظ سے محفل میں وہ
رنگ قائم ہوتا تھا جو بڑے بڑے نکات و مطالب سے حاصل نہیں ہو سکتا ایسے
دن ارباب فہم سمجھ جاتے تھے کہ مولانا نے تیاری نہیں کی ہے لیکن اس تیاری
نہ کرنے میں وہ جوہر ہوتا تھا کہ جو ہزار تیاریوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

حسن ترجمہ منبر پر عربی عبارتوں کا ترجمہ کرنا مولانا مرحوم کا حصہ تھا وہ اصل تحت اللفظی معنی کو ایسے قالب میں ڈھال دیتے تھے کہ سامعہ اور عقل دونوں کو لذت حاصل ہوتی تھی۔

سورۂ ہل اتیٰ میں (یوماعبوسا) کا ترجمہ اُنھوں نے کیا "وہ دن
جو تیوریوں پر بل ڈالے ہوئے ہوگا"

من اراد ان ینظر الیٰ ادم فی علمہ والیٰ نوح فی تقواہ الخ
اس کا ترجمہ کیا۔ "جو چاہے آدم کو اُنکے علم سمیت دیکھے نوح کو اُنکے
تقویٰ سمیت" یہ "سمیت" کی لفظ یہاں پر اُن کا حصّہ ہے۔

جناب عباسؑ کے واقعہ شہادت میں جب آپ نے اپنے بھائیوں کو میدان
جہاد میں اپنے پہلے روانہ فرمایا چھوٹے بھائی سے خطاب کر کے طبری میں
یہ فقرہ ہے "فانہ لیس لک ولد" اس کا ترجمہ اُنھوں نے کیا "جاؤ
تمھارے تو کوئی اولاد بھی نہیں ہے"۔ اس "تو" اور "بھی" میں معنی

کا سر چشمہ ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ بعض کوتاہ نظر اور پست طبیعت مورخوں نے لیس لک ولد کے یہ معنی کیے ہیں کہ تمھارے کوئی اولاد نہیں لہٰذا تمھاری میراث مجھے ملے گی اور وہ میری اولاد کی طرف منتقل ہوگی" یہ وہ چیز ہے جو کسی طرح شان وجلالت جناب عباسؑ کے شایاں نہیں۔ مولانا نے ترجمہ میں اس "تو" اور "بھی" کی لفظ سے یہ دکھلایا ہے کہ حقیقۃً یہ تحسر اور افسوس کا ایک جملہ تھا جو جناب عباسؑ کی زبان سے نکلا مطلب یہ تھا کہ "تمھارے تو کوئی اولاد بھی نہیں ہے جو بطور نشانی و یادگار تمھارے بعد باقی رہے۔ اسلئے تمھارا مرنا زیادہ حسرتناک ہے۔

ایسے نہ معلوم کتنے ترجمے وہ کر دیتے تھے جس سے فوراً طبیعت کے اوپر وجد کا عالم طاری ہوتا تھا۔

وہ سب یاد کسے ہیں اور اُس موقع پر یہ احساس کب تھا کہ انھیں محفوظ رکھنا چاہیئے کسی وقت ضرورت پڑے گی کہ یہ قلمبند کئے جائیں۔

نکات و مضامین

یہ وہ باب ہے کہ جسے پورے شرح و بسط کے ساتھ لکھنے کی ضرورت تھی لیکن افسوس ہے کہ اُنکی تقریریں قلمبند ہوئیں نہیں اور اُن کے مضامین محفوظ صورت میں نہیں آئے۔

انھوں نے اپنی عمر میں ہزارہا مجالس پڑھے اور ہر مجلس میں اُنکی

خلاق طبیعت کچھ نہ کچھ نئے نکات و مضامین پیدا کرتی تھی۔ اگر وہ اسوقت محفوظ ہوتے تو کئی مجلدات کا سرمایہ ہوتے خاص بات یہ تھی کہ ادھر اُنکے موکھ سے کوئی نکتہ کسی مجلس میں نکلا اور دوسرے لے اڑے۔ اسلئے دوسروں کی زبان سے سنتے سنتے اُنکی ندرت بھی جاتی رہی اور اب اُن میں کسی خاص حسن کا طبیعت اندازہ نہیں کرتی۔

قلم برداشتہ اسوقت بعض نکتے اُن کے جو یاد آئے جاتے ہیں لکھتے ہیں اور کوتاہی قلم میں تقصیر کے معترف ہیں اسلئے کہ قلم اپنی تمام جد و جہد کے بعد بھی اتنی حسین صورت میں مضمون کو پیش نہیں کرسکتا جو اُن کے بیان میں سامعین کے پیش نظر ہوتی تھی۔

حدیث اعطائے خاتم میں روایت یہ بتلاتی ہے کہ سائل نے پہلے اہل مسجد سے سوال کیا، کسی نے کچھ جواب نہ دیا، اُسوقت وہ خدا کی طرف متوجہ ہوا اُس نے کہا بارالٰہا گواہ رہنا کہ میں نے تیری مسجد میں سوال کیا اور اب محروم واپس جاتا ہوں۔ یہ کہنا تھا اُس کا کہ علی بن ابیطالبؑ نے انگشت سے اشارہ کیا اور اُس نے انگوٹھی اتار لی یہ عجب بات ہے کہ جبتک وہ اہل مسجد سے سوال کرتا رہا علیؑ خاموش کھڑے رہے، اسکے سوال کو پورا نہ کیا۔

بات یہ تھی کہ امیرالمومنینؑ اسوقت حالت نماز میں تھے، اور ح

بارگاہ قدس سے متعلق تھی دنیا والوں کی طرف جب تک سوال رہا حضرت کو خبر نہ ہوئی۔ جب خدا کی طرف متوجہ ہوا آواز بلند ہوئی اور بارگاہ احدیت میں پہونچی۔ بس اب علی کی روح کو خبر ہو گئی۔ اس نے جسم کو اشارہ کیا اور انگلی سائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

کیا کہنا تخییل ہے کہ استدلالی برہان جس نے خضوع و خشوع کی منافات والے اعتراض کو بالکل برطرف کر دیا۔

———۰۰———

حدیث میں ہے کہ اولاد رسولؐ میں جتنے ائمہؑ متولد ہوئے سب کی پشت پر مہر نبوت کا نشان ہوتا تھا۔

اسکے متعلق مولانا نے ایک مرتبہ یہ بیان فرمایا کہ قاعدہ ہے مہر جتنا دبے گی اتنا نشان اسکا گہرا اتریگا۔ کعبہ میں یہ مہر نبوت علیؑ کے پاؤں کے نیچے کچھ اس طرح دبی کہ جتنے ورق کتاب نبوت کے تھے سب پر اس مہر کا نشان ابھر آیا۔

اس کا نام ہے تخییل اور یہ ہے حسن تعلیل۔

———۰۰———

حضرت حجت عجل اللہ فرجہ کے متعلق ہے کہ آپ جب متولد ہوئے تو آپ کی پشت مبارک پر دونوں طرف مہریں تھیں جن پر دو آئتیں نقش تھیں۔

اسکے متعلق ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ قاعدہ ہے مہر خاتمہ پر ہوتی ہے رسالتمآبؐ پر نبوت ختم ہوتی تھی اسلئے وہاں مہر خاتمیت کی ضرورت پڑی۔

حضرت حجت اور تمام ائمہ معصومینؑ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین وقائم مقام ہیں ان تک دورِ نبوت رسالتمآبؐ باقی تھا اسلئے وہ مہر خاتمیت برابران کے شانوں پر ہوتی رہی جس سے معلوم ہو کہ دور ایک ہی دور ہے اور زمانہ ایک ہی زمانہ لیکن حضرت حجت پر پھر یہ سلسلہ ختم ہو رہا تھا اسلئے یہاں دو مہریں ہو گئیں ایک تو وہی مہر ختم نبوت ہے اور دوسری مہر ختم امامت۔

حضرت صدیقہ کبریٰ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی عصمت کے بارے میں فرمایا کہ دیکھئے شب عید بچوں کے لئے اگر یہ کہہ دیا تھا کہ لباس تمہارا خیاط کے پاس ہے تو رضوان جب آیا اس نے یہی کہا کہ درزی ہوں، بچوں کے کپڑے لیکر آیا ہوں۔ یہ نہیں کہا کہ رضوان ہوں تاکہ فاطمہ زہراؑ کی صداقت پر اثر نہ پڑنے پائے۔
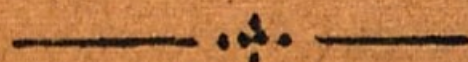
سورہ ہل اتیٰ کی تفسیر میں بیان فرمایا کہ علی بن ابیطالبؑ نے تین دن روٹیاں دی تھیں تو خداوند عالم نے تین آیتیں اتاریں۔ اودھر سے گئی تھیں

روٹیاں مگر ایسی پاک اور مقدس تھیں کہ میزان عدل میں آیات قرآنی کے سوا انکے مقابلہ میں کوئی چیز نہ سکی اور پھر من جاء بالحسنة فلہ عشر امثالھا تین روٹیاں دی تھیں اور تیس آیتیں اسکے بدلے میں عطا ہوئیں۔

سورہ ہل اتی میں سب کچھ ہے مگر حوروں کا تذکرہ نہیں ہے بات یہ ہے کہ ارباب عمل میں سیدہ ایسی معظمہ خاتون بھی داخل تھی۔ حوروں کا تذکرہ اس معظمہ کے سامنے نازیبا اور غیر مناسب تھا۔

فضہ کا عمل کچھ ایسا پسند ہوا کہ لفظ " فضہ " کا تذکرہ سورہ میں صراحت کیا نہ کر دیا گیا۔

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنة۔

اس آیت میں تو عام مومنین کے نفوس واموال کی قیمت جنت قرار دی گئی ہے پھر اب امیر المومنینؑ کی جان کی قیمت کیا ہو سکتی ہے ؟ کیا وہی جنت ؟ ہرگز نہیں۔

اس جان کی قیمت اس سے بلند ہونا چاہیئے سودا رضائے الٰہی کر

کوئی چیز نہیں۔

ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ۔

رضائے الٰہی کی عظمت یہ ہے کہ ارشاد ہوتا ہے رضوان من اللہ اکبر

رضوان پر تنوین تقلیل اور اسکے ساتھ ارشاد ہے کہ وہ بڑی سے بڑی چیز ہے۔

اور علی کو نفس کی قیمت میں مرضات اللہ کا مالک بنا دیا گیا۔ پھر

جب مرضات اللہ کے مالک ہو گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنت میں اختیار کلی

حاصل جس کو چاہے جنت میں داخل کریں اور جس کو چاہیں نار میں۔ اسکے بعد

[illegible] دعائیں کی جائیں

رضی اللہ عنہ رضی اللہ عنہ لیکن رضائے الٰہی تو اب ذات علیؑ میں منحصر ہے

کہ جب تک دین اسلام مرضی (پسندیدۂ خدا) نہیں ہوا جبتک ولایت

علی کا جزو و شریک نہیں ہو گیا۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی

ورضیت لکم الاسلام دینا۔

امیر المومنینؑ اپنے نفس کو بیچ چکے تھے جبھی شب ہجرت بڑے اطمینان سے

سوئے کہ اب جس کی ملک ہے وہ خود ہی حفاظت کریگا اور اس نے حفاظت

کی [illegible] کی طرف بھیجے گئے اور [illegible] اور وہ کہہ رہے تھے

بخ بخ لک یا ابن ابی طالب من مثلک فان اللہ یباھی بک

علی الملائکۃ۔

جب علیؑ کا نفس فروخت ہو چکا تو وہ اب علیؑ کا کب رہا خدا کا ہو گیا اب علیؑ کے ہاتھ ید اللہ علی کی آنکھ عین اللہ علیؑ کی آنکھ عین اللہ علیؑ کا پہلو جنب اللہ اور علیؑ کا نفس نفس اللہ ہے۔

شب ہجرت امیر المومنینؑ نے رسولؐ کے بستر پر آرام کیا رسولؐ کے چادر اوپر سے تھی۔

یاد رکھنے کے قابل ہے آج کی رات کا بچھونا اور خیبر کے دن کا تکیہ جب شکایت کی کہ میری آنکھیں درد آلود ہیں رسولؐ نے زانو پر اپنے علی کا سر رکھا اور اپنا لعاب دہن علی کی آنکھوں میں لگایا۔

انداز دیکھنے کے قابل ہے یہ نہیں کیا کہ اپنے دہن سے لعاب علیؑ کے آنکھ پر ڈالدیں بلکہ اپنی انگلی میں لیکر لگا رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دہن کی رطوبت جب خود دہن سے الگ ہو جائے تو وہ تھوک ہے۔ اور دہن میں ہو تو لعاب ہے۔ رسولؐ نے اپنی انگلی سے علیؑ کی آنکھ میں لگایا جس میں وہی انداز ہے کہ جو قرآن کے ورق گردانے میں ہوتا ہے۔

رجعت شمس کے متعلق بیان فرمایا کہ رسالتمآبؐ نے بارگاہ احدیت میں عرض کیا ان کان علی فی طاعتک وطاعۃ رسولک بہ دعائے رسولؐ علی شہادت رجع شمس کے ساتھ نص ہوگئی امیر المومنینؑ کی عصمت پر۔

آفتاب کے متعلق احادیث میں ہے کہ وہ بوقت غروب خالق کے سجدہ میں جھکا ہوتا ہے۔

یہ عجب نماز تھی جس کے لئے آفتاب کا سجدہ قطع ہوا اور وہ پلٹ کر اپنے اُس نقطہ پر آیا جہاں عصر کے وقت پر ہوتا ہے۔ قابل مبارکباد ہے وہ کہ آج ٹھہرا ہوا علی ابن ابیطالب کی نماز کی زیارت کر رہا ہے۔ ادھر نماز ختم ہوئی اُدھر پھر وہ مغرب کی طرف روانہ ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ نے دربار نمرود میں کہا تھا ان اللہ یأتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب اسکے معنی یہ تھے کہ خدا جس طرح آفتاب کو مشرق سے نکالنے پر قدرت رکھتا ہے اسی طرح مغرب سے نکالنے پر قادر ہے۔

ابراہیم نے فقط دعویٰ کیا تھا۔ علیؑ نے اُس کو پایۂ ثبوت تک پہنچادیا کہ دیکھو میرا خدا آفتاب کو مغرب سے بھی نکال رہا ہے۔

اسی لئے نماز پڑھی اور دعا کی کہ یہ نہ معلوم ہو کہ آپنے اپنی ذاتی

قدرت سے ایسا کیا۔

یہ عجب بات ہو کہ رسالتمآبؐ کیلئے چاند کا معجزہ ظاہر ہو شق القمر ہوا اور علی کے لئے آفتاب کا معجزہ رجعت شمس ہوا حالانکہ بظاہر مناسبت کا تقاضا تھا کہ آفتاب کا معجزہ رسولؐ کے لئے ظاہر ہو اور چاند کا معجزہ علی بن ابیطالبؑ کیلئے مگر اس کا عکس ہوگیا۔ بات یہ ہے کہ جہاں تاریکی کا زیادہ خوف ہو وہاں روشنی زائد ڈالی جاتی ہے۔ معلوم تھا کہ امیر المومنینؑ کی نسبت اختلافات زیادہ ہونگے اسلئے یہاں روشنی تیز کردی گئی۔

واقعہ بت شکنی میں رسالتمآبؐ نے امیر المومنینؑ کے شانوں پر قدم رکھے تو امیر المومنینؑ میں ضعف کا اظہار ہوا اور حضرت نے فرمایا کہ تم بار نبوت اٹھا نہیں سکو گے۔

لوگ کہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں نے رسالتمآبؐ کے بار کو اٹھا لیا اور شب ہجرت دور تک لیگئے تو امیر المومنینؑ کے مقابلہ میں اُنکی فضیلت ظاہر ہوئی۔

مولانا نے اسکے متعلق فرمایا کہ جب کسی دو چیزوں میں جوہر حقیقت کا اشتراک ہوتا ہے اور پھر ایک دوسرے سے غالب تو دوسری شے میں اُس کا

اثر ظاہر ہوتا ہے لیکن اگر جوہر و حقیقت کا اشتراک ہو ہی نہیں تو کچھ نہیں مثلاً آفتاب کے مقابلہ میں ہاتھ رکھدیجیے - پاؤں رکھدیجیے اسکی روشنی کا کوئی اندازہ نہوگا نہ خیرگی پیدا ہوگی نہ چکا چوند لیکن اگر آنکھ کو آفتاب کے مقابل لے آیئے تو چونکہ آنکھ میں خود نور و ضیا ہے اسلئے وہ اپنے سے زیادہ ضیا کی تاب نہ لاکر مضطرب ہوگی اور چکا چوند پیدا ہوجائے گی - بس یونہی وہ جوہر رسالت جو حضرت رسولؐ میں ودیعت تھا اسکے ساتھ دوسرے افراد میں کوئی جہت اشتراک تھی ہی نہیں اسلئے اس کا کوئی وزن بھی محسوس نہ ہوا اور جہاں وہی جوہر مشترک موجود تھا اس نے اس کی طاقت کا احساس کیا اور وزن معلوم ہوا -

---

حضرت موسیٰ برق تجلّی کی تاب نہ لاسکے اور غش کھاکر گر پڑے - روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کروبین میں سے ایک فرشتہ کے چہرہ کی چھوٹ تھی جس نے نقاب سرکادی تھی اس سے موسیٰ کا یہ عالم ہوا -

مگر کیا کہنا ہمارے رسولؐ کی قوت نگاہ کا کہ معراج کی شب کروبین کی صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ گئے -

---

تیرہ رجب کی شب کی مسجد تحسین والی صحبت میں ایک سائل مبتدا کی اس

آیت سے ولو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ "اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو وہ خدا کی عظمت کے احساس سے شق ہو جاتا۔"

اُنھوں نے کہا کہ معلوم ہوا حقیقی قرآن کی تاثیر یہ ہے کہ جمادات شق ہوتے ہوئے نظر آئیں۔

اُنھوں نے اسکے متعلق بیان کو بسط دیتے ہوئے حضرت موسیٰ کے لئے دریا کا شق ہونا اور پتھر میں شگاف پیدا ہو کے چشمہ پھوٹنا اور رسولؐ کیلئے ماہتاب کا دو ٹکڑے ہونا، اس سب کو بڑے لطف کیسا تھ بیان کیا۔

پھر کہا کہ جس طرح شق دریا موسیٰ کا اعجاز تھا شق قمر محمد مصطفیٰ کی اعجاز اسی طرح شق جدار کعبہ علی کا اعجاز تھا اور یہ اس آیت الٰہی کی عظمت تھی جس نے دیوار کو شگافتہ کر دیا۔

مصائب کے سلسلہ میں حضرت سید الشہداء نے جناب علی اصغر کو میدان جہاد میں لا کر کیوں شہید کرا دیا۔ شاید اسلئے کہ ماں بہنوں کی تو مشکیں پس گردن سے بندھی ہونگی۔ علی اصغر کی زندگی کی کیا صورت ہوگی۔

جناب علی اکبر جب گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے آواز دی

یا ابت علیک منی السلام ھذا جدی رسول اللہ قد سقانی
بکاسہ الاوفی۔

جناب علی اکبرؑ نے سلام الٹ کیوں دیا۔ سلام علیک کیوں نہ کہا
اسلئےکہ سوال آپکے موقع پر باپ کی زبان کو دیکھ چکے تھے کہ اپنی زبان سے
زیادہ خشک۔ اسلئے سلام میں جواب کا انداز اختیار کر لیا کہ امامؑ کو جواب
نہ دینا پڑے۔ پھر یہ کیوں کہا کہ ھذا جدی رسول اللہ قد سقانی
بکاسہ الاوفی۔

اسلئے کہ امامؑ سے پانی کا سوال کر چکے تھے اور جانتے تھے کہ امامؑ کے دل پر
میری پیاس کا اثر ہوگا تو چاہا امام کو تسکین دیدیں کہ بابا میری پیاس کا
خیال نہ کیجئے گا۔ میرے نانا رسالتمآبؐ نے مجھ کو سیراب کر دیا ہے۔

جناب عباس نے امام حسینؑ کو اسوقت آواز دی جب پانی مشک کا بہہ گیا
اور گرز سر پر لگ چکا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اے مولا آپ نے اسوقت بھائی کو
کیوں نہ پکار لیا جب ہاتھ دونوں قطع ہو گئے تھے کہ پانی تو خیمہ میں پہنچ جاتا
تو شاید جناب عباس جواب دیں پکارتا کیونکر؟ تسمہ مشک کا دانتوں میں تھا

حضرت سید الشہداء کے سر مبارک نے بازار کوفہ میں سورہ کہف کی تلاوت
کی۔ بات یہ ہے کہ مجمع نامحرموں کا وہاں بہت تھا حضرت نے سورہ کی تلاوت

اس لئے شروع کر دی کہ لوگ میرے سر کی طرف دیکھنے میں محو ہوں اور بہن کا پردہ محفوظ ہو جائے۔

شب عید حسنین کے لباس مانگنے کی روایت بہت اثر کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اور ربط کے الفاظ اُن کے یہ تھے کہ "سن کے ساتھ انسان کی خواہشیں بھی بدلتی ہیں۔ اس زمانہ میں سیدہ عالم سے لباس نو کی خواہش کی اور روز عاشور بہن سے لباس کہنہ کی فرمائش کی۔"

جناب مولوی چھبن صاحب مرحوم لکھنؤ کے ایک بڑے مقدس، ہردلعزیز واعظ اور مقبول ذاکر حضرت سید الشہدا تھے۔ اُن کا انتقال ہوا تو چہلم کی مجلس مولانا سبط حسن صاحب مرحوم نے پڑھی یہ فقرہ اُن کا اب تک لوگوں کو یاد ہے کہ مرحوم کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے "زندگی میں جب راستے میں ملے۔ اُن سے کہا آگے چلیے کبھی آگے چلنا پسند نہ کیا مگر اب نہ معلوم کیا تھا کہ تابوت میں آگے آگے جا رہے تھے۔" اس فقرہ سے مجلس میں وہ کہرام تھا جو پورے مصائب کے تذکرہ میں ہو سکتا ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہیں کہ سب سے پہلے انھوں نے بیان فرمائیں اور اس

پر لطف انداز سے کہ جو انھی سے مخصوص ہو گیا۔

ان میں خاص چیز "نحل" (شہد کی مکھی) کے حالات کا تذکرہ ہے جو اُن کا خاص موضوع تھا اور اس کو نہایت بسط سے بیان کرتے تھے اور اس طرح کہ اہل مجلس محو ہوتے تھے اور وہ کچھ ایسی چیزیں تھیں کہ قلم اُنکی مصوری سے قاصر ہے۔

جنگ خیبر کے بیان کا انداز اُن کا نرالا تھا۔ آگرہ میں مزار شہید ثالث کی مجلس میں ایک مرتبہ یہ کہکر پڑھے کہ "مجلس کا صفحہ آج تاریخ کا ورق ہوگا" اور پھر خیبر کی لڑائی اس یادگار طریقہ سے بیان کی کہ مجلس حقیقۃً تاریخ کا ایک یادگار ورق بن گئی۔ لعاب دہن لگانے کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے تھے "آب وحی میں حل کیا ہوا سرمہ آنکھ میں لگایا"

اکثر اُنھوں نے مجالس استدلالی رنگ میں پڑھے ہیں۔ اور اس میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ ایک مرتبہ عشرہ محرم کے قبل عزاداری کی مخالفت کا بڑا زور و شور تھا۔ شاید کچھ اشتہارات و مضامین بھی نکلے تھے اور اگر یاد غلطی نہیں کرتی تو مولانا کے پاس کچھ خطوط بھی آ گئے تھے۔ آپنے دس روز تک شیخ علی عباس صاحب وکیل مرحوم کی کوٹھی میں صرف عزاداری کے اثبات پر تقریر کی اور انتہائی مکمل طریقہ سے اس موضوع کو بیان فرمایا۔

اسی طرح یہ اعتراض کہ "قاتلان امام حسینؑ شیعہ تھے" اس کو ایک پوری مجلس میں ۱۵ محرم کی جو اختر حسین صاحب افسر حسین صاحب اظہر حسین صاحب ساکنان نرہی حضرت گنج کی طرف سے جناب غفران مآب کے امامباڑہ میں ہوتی تھی اس میں بیان فرمایا اور مکمل تاریخی ثبوت اس کا پیش کیا کہ قاتلان امام مظلومؑ شیعہ نہیں تھے۔

مصائب وہ سخت کبھی نہیں پڑھتے تھے۔ فقرے ہوتے تھے کہ جو دلوں کو برماتے تھے اور نشتر کا کام کرتے تھے۔ ساتویں تاریخ محرم کی جناب قاسمؑ کا اور آٹھویں تاریخ جناب عباسؑ کا حال پڑھتے تھے اور وہ یادگار مجلسیں ہوتی تھیں۔ نویں تاریخ ہمیشہ وہ جناب علی اکبر کا حال بیان کرتے تھے مصائب میں بعض چیزیں ہیں جو سب سے پہلے انھوں نے بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً جناب عباسؑ جب نہر پر تشریف لے گئے ہیں تو فقط نیزہ آپکے ہاتھ میں تھا۔

جناب علی اکبرؑ جب رخصت ہو کے چلے تو امام حسینؑ پیچھے کچھ دور تشریف لے گئے اس طرح کہ جتنا جتنا گھوڑا علی اکبر کا تیز ہوتا جاتا تھا، امامؑ کی رفتار بڑھتی جاتی تھی۔ یہ چیز جب انھوں نے بیان کی ہے مجلس میں تلاطم ہو گیا ہے

کرڑہ کی ایک مجلس میں جو نواب سکندر آغا صاحب کی طرف سے شب کے وقت ہوتی ہے اُنھوں نے بیان فرمایا کہ امامؑ کے گلے سے خون جاری ہوا اُس سے زمین پر تحریر یہ ہو رہا تھا۔

سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

نقل روایات میں ذمہ داری کا احساس رکھتے تھے کبھی اُنھوں نے غیر معتبر روایت نہ بیان کی اور نہ زیادتی اثر کے لئے مثل اکثر واعظین کے اُنھوں نے اجزائے روایت میں ردو بدل کی۔ مشہور علماء کے کتب اور مستند تواریخ سے بیان کرتے تھے اور عام فارسی مقاتل کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔

معراج الکلام طرز بیان اُن کا ایسا تھا کہ اگر مختصر نویسی کے ذریعہ سے اُن کی اصل تقریر کو قلمبند کر لیا جاتا تب بھی اس میں وہ لطف پایا نہیں جا سکتا تھا جو اُن کی تقریر میں ودیعت تھا۔ پھر بھی کم از کم وہ الفاظ ہم تک پہونچ جاتے جو اُنکے لب و دہن سے نکل کر دلوں کو مسخر کرتے تھے لیکن افسوس ہے کہ ایسا بھی نہیں ہوا اور اُن کی تقریریں قلمبند نہیں ہوئیں۔

وہ اپنے عروج کمال کے زمانہ میں مسودہ نہیں لکھتے تھے بلکہ عربی کے نوٹ ہوتے تھے جو اُنکی کتاب پر درج ہوتے۔

بیشک وسطی زمانہ یعنی شروع زمانہ ترقی میں وہ مسودے بناتے تھے

انہی میں سے دس مسودے وہ ہیں جو "معراج الکلام" کے نام سے شایع ہوئے ہیں اُن میں بھی حقیقت یہ ہے کہ عربی عبارتوں کا ترجمہ نہیں تھا۔ وہ طبع کتاب کے موقع پر جناب مولانا سید وجاہت حسین صاحب ناظم اعلی اللہ مقامہ نے خود کر دیا۔

پھر اگر مولانا ناظم صاحب مرحوم کا وہ زمانہ ہوتا جب وہ اپنے حسن بیان کا سکہ قائم کر رہے تھے جس کا تذکرہ ہم بعد میں کریں گے تو یقیناً ترجمہ میں بہت کچھ وہ رنگ محفوظ رہتا جو اُنکے اُستاد علامہ مولانا سبط حسن صاحب کا تھا لیکن وہ ناظم صاحب قبلہ مرحوم کا بھی ابتدائی زمانہ تھا اسلئے ترجمہ بس وہ تحت اللفظ ہی سمجھنا چاہیئے۔

بیان مطالب میں بھی جہاں تک دیکھا جاتا ہے عبارت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے بلکہ نفس مضامین کو بطور یادداشت درج کیا گیا ہے جس کی آرائش منبر کے اوپر الفاظ کے ذریعہ سے ہوتی ہوگی اسلئے کسی حیثیت سے اس کتاب کو مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کے خصوصیات بیان کا حامل نہیں سمجھا جا سکتا لیکن پھر بھی کہیں کہیں پر بعض مضامین اور فقرے اس رنگ کے آجاتے ہیں جو مولانا موصوف کی یاد دلاتے ہیں اسلئے ہم "معراج الکلام" میں سے بطور انتخاب صرف اُن اجزاء کو پیش کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک مولانا کے انداز بیان کے ایک حد تک صحیح حامل ہیں۔

پہلے خود مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کی وہ توثیق درج کرتے ہیں جو معراج الکلام کے دوسرے صفحہ پر درج ہے اس سے ان مسودات کی کیفیت تالیف کا بھی پتہ چلتا ہے۔

"مجھ سے اپنی عنایت اور محبت سے میرے دوست عنایت فرما عزیز روح فضیلت مآب جمیل المناقب دوحہ مورقہ بوستان رشاد شعلۂ شموع دودمان اجتہاد مولوی سید وجاہت حسین صاحب دام اقتدر فی حرزہ المنیع وبلغہ الی المحل الرفیع نے چند مرتبہ خواہش کی کہ میری پڑھی ہوئی مجلسیں شایع کی جائیں۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ وہ کیا ہیں اور کسی طرح بھی میری کم سوادی کی جہت سے قابل اشاعت نہیں اسوجہ سے متواتر انکار کرتا رہا یہاں تک کہ انکار کی وہ حد سامنے آئی جس پر شبہہ ہوتا تھا کہ عمدہ ہونے کی جہت سے بخل کیا جاتا ہے۔ اس شبہہ کا برطرف کرنا بھی ضرور تھا، اُنکی خاطر بھی ضروری تھی۔ آخر کار میں نے ایک عشرہ محرم کے مسودات (جو مرادآباد میں میں نے یوں لکھے تھے کہ شکوہ اپنے لئے ایک مجلس اُسکے لکھنے میں منعقد کر لیتا تھا اور صبح کو وہی لکھا ہوا مجلس میں پڑھ دیا کرتا تھا) موصوف کے حوالے کر دیے۔ اس میں بہت سی غلطیاں ہوں گی جن میں بہت سے اغلاط ہمارے ممدوح نے اپنی عنایت سے دور کر دئے ہونگے۔ عربی عبارتوں کا ترجمہ

بھی کر دیا ہوگا میں اپنی عدیم الفرصتی کی جہت سے مجبور ہوں۔ ذی علم اہل نظر کے دامن فضل میں اتنی وسعت ہے کہ اسکے تمام نقص اُسکے زیر سایہ پناہ لے سکیں، اور دل سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ واللہ المستعان۔

ناچیز سبط حسن
۳۰ شوال سنہ ۱۳۳۳ھ

اس پورے عشرہ مجالس کی ابتدا اس آیت سے ہے۔

لو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السموات والارض ومن فیھن بل اتیناھم بذکرھم فھم عن ذکرھم معرضون ام تسألھم خرجا فخراج ربك خیر وھو خیر الرازقین۔

اب ہم کتاب کے مطالب اور فقرات کا انتخاب شروع کرتے ہیں۔ چونکہ یہ مطالب اکثر دوسرے واعظین کی زبان سے سنائی دیتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا حصہ ہیں اسلئے بھی ہم دکھلانا چاہتے ہیں کہ اصل اس کی کیا ہے اور اس کا منبع و سرچشمہ کونسی ہستی ہے۔

(۱)

وحدت اصل اصول اشیائے

ہم اس دعوے کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کرتے بلکہ عالم کے رطب و

یا بس جو چیزیں ہیں اُن سب میں ہمارا یہ کلیہ جاری اور ساری ہے یہاں تک کہ
وحدت حقیقی کا ایک عکس وحدت مجازی پر پڑا ہے تو اُس میں بھی بھی جلوہ
نظر آ رہا ہے بایں معنی کہ اگر ہم وحدت حقیقی سے قطع نظر کریں تو وحدت مجازی
جو ظاہری نظر میں وحدت ہے وہ بھی اصل بعض اشیاء معلوم ہوتی ہے اور
جس مجموعہ پر اور جس متکثر شے پر نظر ڈالی جاتی ہے قوت عاقلہ اپنے ایک
انتقال میں وحدت کی طرف کھنچ جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
عموماً اصل کثرت وحدت ہوتی ہے بلکہ اس حکم عقل سے اگر ہم تھوڑی دیر
کے لئے قطع نظر کریں تب بھی ہم اس امر کا منکر سے سوال کر سکتے ہیں کہ کسی
ایسے کثیر کا نشان دو جو بغیر شمول وحدت کثیر ہو گیا ہو۔ عالم کی نظیریں ختم
ہو جائینگی مگر ایسے کثیر کا پتہ نہ ملیگا جو بغیر اعانت وحدت متکثر ہو گیا ہو
لہذا جو کچھ اجزا مجموعۂ عالم منتظم یا پریشان نظر آ سکتے ہیں اُن سب کا مرجع
وملاذ وحدت ہے۔ ان باتوں پر ایک غور کی نظر ڈالنے سے یہ امر منکشف ہو سکتا
ہے کہ کثرت کے لئے سیکڑوں نظیریں ہو سکتی ہیں اور وحدت اپنی آپ ہی نظیر ہے

(انتقالات عقل کی نظیریں) برگ و شجر شاخ و ثمر ایک نظر کرنے سے نواۃ
کی طرف ذہن فوراً منتقل ہوتا ہے کہ انکی نشو و نما تمام اُسی کی طرف منجر ہے
انسانی افراد کا انتشار اور اُن کی کثرت آدم کی طرف منجر ہے خود انسان
میں اعضا و جوارح کی کثرت نطفہ کی طرف منتہی ہے۔ اسی میں افراد حیوانات کی

شریک ہیں۔ تمام قوائے متصرفہ کی حس وحرکت کی انتہا روح کی طرف ہوتی
ہے۔ اس میں اکثر مثالیں ایسی تھیں جو وحدت مجازی کی حیثیت سے اصول
واقع ہوئی ہیں پھر کیا خیال ہو سکتا ہے بسیط حقیقی اور واحد صرف کی طرف
کہ وہ تو بدرجۂ اولیٰ اصل اشیاء ہونے کے لائق ہے کیونکہ وحدات مجازیہ
جو نظر ظاہری میں اصول نظر آتے ہیں وحدت واقعیہ وحقیقیہ تو انکی
بھی اصل ہے۔ اس اصل کے تلاش کرنے میں قریب سب عقلا
متفق ہو کر تشخیص میں درماندہ ہو گئے۔ ڈھونڈھا ضرور مگر اکثر نے اس
گوہر یکتا و نایاب کو کثرت میں ڈھونڈھا کروڑوں افراد سامنے تھے تشخیص
میں چوک گئے وحدت تو ملی مگر جس کو واحد سمجھا تھا وہ نظر کا دھوکا تھا کیونکہ
وہ کثرت سے ملوث ملا۔ بہرطور کچھ بھی ہوا ہو یہ ضرور ہوا کہ وحدت یہاں تک
تسلیم کی گئی کہ اسی پر صانع کا انحصار ہو گیا اور جنھوں نے تین کے وہ بھی چاہتے
ہیں کہ توحید ہاتھ سے نہ جائے یہاں تک کہ توحید فی التثلیث سے تعبیر کی
اگرچہ وہ لغو ہی سہی۔ رہ گئے ثنویہ انھوں نے اس اصل مسلم سے کنارہ کشی کی
مگر تقسیم میں شر وخیر کے لئے ایک ہی فاعل تجویز کیا۔ عرب کے بت پرستوں کی
عقلیں اس حد پر گئی تھیں کہ ان تمام براہین سے کنارہ کشی کر کے اور حکم عقل
سے گذر کے ایک دم سے تین سو ساٹھ [٣٦٠] خداؤں کو تسلیم کیا کہ یہی ہمارے معبود ہیں
کوئی برہان اور کوئی دلیل اُن کے ہاتھ میں نہ تھی جس سے وہ اپنے اس

مقصد کو ثابت کر سکتے لیکن صرف یہ امر کہ اُن کے باپ دادا کا شیوہ یہی تھا
او لو کان آبا ؤھم لا یعقلون جب وحدت چھوڑی تھی تو رایوں کی
کثرت سے خداؤں کی کثرت پیدا ہو گئی تھی مگر وحدت جو نہ تھی تو اُن میں سے
ایک بھی خدا نہ تھا۔ وہ مکان عالیشان جو ابراہیم و اسمٰعیل علیٰ نبینا و آلہ
وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھوں بنایا گیا تھا وہ خود اُسی خدائے واحد و
یکتا کے برگزیدہ مخلوقوں کا بنایا ہوا تھا وہ خود مادہ مخلوقہ سے مجسم اور مخلوقوں
کے ہاتھ کے بنائے ہوئے تھے۔ ان کمینوں کو اپنے متمکن ہونے میں اسی کے
گھر کی دیوار کی احتیاج تھی۔ اسی کے مخلوقوں کے صنع و ساخت کی ضرورت
تھی مع ذلک پھر خدا تسلیم کئے جاتے تھے۔ انسانی ذلتیں جو اسکے حسیں
نفس کے مقتضا میں داخل ہو گئے ہیں۔ اسلئے وہ بغیر قوت عاقلہ سے کام
لئے ہوئے اپنے دائرہ حتیاج کو خود وسیع کرتا ہے۔

ایک دروازہ کریم لاکھوں ابواب لئیم سے بہتر اور نافع تر ہے مگر سائل
کج فہم کو اتنی شناخت بھی تو ہو کہ کونسا باب کریم ہے۔ وہ ہر دروازہ کا قارع
اور ہر کس و ناکس سے سائل ہوتا ہے اور نہیں خیال آتا کہ ہزار جگہ کی ناکامی
اور ذلت سے کہیں بہتر ہے وہ باب جہاں سے سائل ردی نہیں ہوتا؟

میں نے نشان اُن عبارتوں پہ کھینچا ہے جو میرے خیال میں ہر ایک کی
زبان سے بھی قریب قریب انہی الفاظ میں ادا ہوئے ہوں گے جو کتاب میں

مندرج ہیں۔

(۲)

آج کل وہ زمانہ ہے کہ حق بھی نوحہ کر رہا ہے کیونکہ اُس کا حافظ و ناصر اسی کی حمایت میں قتل ہو گیا۔

یہ ربط مصائب ہے جس کے بعد ولید کا امام حسینؑ سے طلب بیعت کرنا اور امام کا جواب موثر انداز سے مذکور ہوا ہے۔

(۳)

کلام پاک کی تصریح سے یہ امر بالکل صاف صاف ظاہر ہے کہ اگر حق اپنا مرکز چھوڑ دے تو تمام اشیاء باطل ہو جائینگی یا بمعنی کہ کوئی شے اپنے محل پر قائم نہیں رہ سکتی یہانتک کہ بہت عظیم شے جس سے بڑھکر کوئی نمایاں استوار عالم میں دکھلائی نہیں دیتی اور کسی شے سے وہ فاسد نہیں ہوتا، نہ وہ طول زماں سے کہنہ ہوتا ہے، نہ وہ بارش آب سے مضمحل ہوتا ہے۔ نہ کسی بادشاہ کا قصر اپنے کنگروں سے اُسکے دامن کو چھو سکتا ہے جس کے صفات خود ارشاد فرمائے ہیں اور اُس کو سات چیزوں سے زینت دی ہے۔ المصابیح ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وبالقمر وجعل القمر فیھن نورا وبالشمس وجعل الشمس سراجا وبالعرش رب العرش العظیم وبالکرسی وسع کرسیه السموات والارض وباللوح

فی لوح محفوظ وبالقلم ون والقلم۔

(۴)

ایک امر یہ قابل غور ہے کہ عمل بالا ہوا ہے کیونکہ فساد اشیاء لازم آتا ہے پھر چھوٹی چیز کو دیکھکر بڑی چیزوں کا فساد بھی اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ ابھی اپنے غیر کو چھوڑ کر اپنے جسم کی طرف ایک نظر کرنی چاہیے۔ اس کو جناب باری نے صفحہ ہستی پر اس انتظام سے بھیجا تھا اور وہ تدبیر کی تھی کہ عناصر اربعہ کے اضداد یوں بہم ہو گئے تھے جیسے ابھی شائبہ ضدیت تھا ہی نہیں جب تک اپنے انتظام میں رکھا تھا حکمت کی گود میں تھا، مرض کا نام نہ تھا ماں باپ کے انتظام میں آیا کبھی انھوں نے کچھ استعمال کیا کبھی کچھ، غذا جو پہونچی تو اپنی دانست میں موافق پہونچائی لیکن در اصل تھی مخالف، بچہ کو مرض پیدا ہوا اور وہ صلاح جس کا باعث نظم الٰہی تھا دہ گیا۔

اب اس فساد کے روکنے کی فکر ہوئی دوائیں دی گئیں۔ دعائیں کی گئیں اگر فساد کم ہوتا گیا تو خیر حالت حقیقیہ پہ پہونچکر پھر اچھا ہو گیا اور نہیں تو وہ فساد ہوا کہ حیات الگ باطل ہوئی جسم الگ باطل ہو گیا۔

(۵)

باالی زمین کچھ اتنا نفع دے نہیں سکتی جس قدر ایک تخم عمل بالا تا ہے اور فائدہ دیتا ہے۔ معاملہ ارضی اور معاملہ الٰہی کا تفرقہ اب سمجھو۔ زمین کو ایک دانہ دیکر

سنبالہ لیا جس میں سات سو دانے ملے یہ تو بواسطہ ارض نفع تھا اور زمین میں یہ جود دستی جواد کا بخشا ہوا ہے وا آلادہ تو اور جیزوں کی خود جاذبہ اور کھینچنے والی ہے اُس کو کہاں یہ بات حاصل تھی کہ وہ اتنے منافع دے لیکن قطرۂ بلند طلعت جو خزینۂ عرش سے نازل ہوا اُس نے شامل ہوکر تنے خسیس میں وہ قوت علو فراہم کر دی کہ زمین پست میں دانہ شگافتہ سے جو کوپل نکلی وہ زمین کی طرف سے رخ موڑے اور آسمان کی طرف توجہ کئے ہوئے۔ یہ تو زمین کی حالت تھی پھر کیا خیال ہے اُس عمل کے متعلق جس کا معاملہ خود خدا سے ہو۔ زمین نے تو سات سو دانے ایک دانہ کے عیوض میں دئے جو مجبور اور محتاج تھی۔ خدائے غنی ایک کی جزا کس قدر دیتا ہے جو مستغنی و مختار ہے۔ یہ ثمر پیدا ہوتا ہے جب کشت دل میں تخم محبت خاصان خدا ہو۔ دانہ تو دانہ کبھی پانی بھی ثمر لاتا ہے اور اس کا لایا ہوا ثمر باد خزاں سے بہر طور محفوظ رہتا ہے۔ یوں تو پانی عموماً نباتات و زراعات میں مفید ہوتا ہے لیکن نہیں کبھی خود ہی تخم ہوتا ہے اور ثمر اُس کا رحمت الٰہی اور مغفرت گناہ حاصل ہوتا ہے۔ کبھی رونا خوف و خشیت الٰہی سے ہوتا ہے کہ اُسکے قطرے بحار غضب خدا کو بجھا دیتے ہیں اور کبھی رونا ماتم فرزند رسول ص پر ہوتا ہے جو موجب غفران ذنوب عظام ہے۔

(۶)

جب یہ امر مسلم ہے کہ محبت آل رسول بحکم قرآن باری بصراحت واجب ہے

تو اور جو مستحبات اس واجب کے خلاف اگر واقع ہونگے اور معارضہ کریں گے
تو بقاعدۂ اصول واجب الترک ہونگے۔ واجب ہو یا مستحب ہو ہر وقت
کے لئے واجب واجب نہیں اور ہر وقت کیلئے مستحب مستحب نہیں حنا کا لگانا
اگرچہ مستحب ہے لیکن اگر اسکی رطوبت سے بخار آجانے کا خوف ہو تو دیکھیں کس
مذہب کا عالم اس کو مستحب بتلاتا ہے؟ مومن کیلئے باسم الوجہ رہنا مستحب ہے
دیکھیں کون شخص تعزیت دینے کے وقت متبسم رہتا ہے۔ مانا کہ سر پر لگانا
مستحب ہے، مگر کیا اسی زمانہ میں جس زمانہ میں مودت واجبہ میں بہ قدح کرے
پیغمبروں کو اگر بفرض محال فرض کر لیا جائے کہ اس زمانہ میں خوشیاں
ہوں تو ہم تو انکی امت میں نہیں ہیں۔ ہوا کرے اُن کو خوشی ہوئی یا ملال
ہم تو دیکھتے ہیں کہ جس نبی کی ہم امت میں ہیں اُس کا گھر اس مہینہ میں لٹ گیا
اور اُس کو ام سلمہ نے سر پر خاک ڈالے ہوئے دیکھا۔ پھر ہم تو جس کی امت
میں ہیں اسی کے تابع ہیں اور لوگ اگر کسی اور نبی کی امت میں ہیں تو وہ اُن کا
پاس کریں۔

(۷)

اگر ہم آسمان و زمین کی حالتوں کو دیکھیں جو باتفاق مورخین ثابت
ہوتی ہیں تو ہمیں پتہ لگجائیگا کہ یوم زینت تھا روز عاشور یا یوم غم۔ آفتاب کا
زیور اتار لیا گیا، آسمان اور زمین سے نضارت لے لی گئی۔ سورج گہن لگا

وہ خون برسانے لگا، زمین سیاہ ہو گئی۔ زینت کے دن کا کیا یہی سماں ہوتا کہ کہنا چاہیئے کہ ایسا دن غم کا کبھی زمانہ پر آیا ہی نہیں۔ رسالتمآب جو آپکے جد تھے اور اصل تھے اُن کے لئے بھی یہ نہیں ہوا۔ غم کا دن تو تھا مگر مرنے پر

رسالتمآب کے خوشیاں کرنے والے تو نہ تھے۔ خداوند عالم نے اُن کی خوشی کے مقابلہ میں اپنی اعظم مخلوق پر غم ظاہر کر دیا گمن کر آپ کی مصیبتوں کو اگر ہر ایک مصیبت پر گریہ و ماتم کیا جائے تو ایام زیست ختم ہو جائینگے مگر مصائب ختم نہیں ہونگے۔ مبدا سفر کی مصیبتوں پر روئیں یا انجام کار پر روئیں یا بعد شہادت جو واقعات گذرے ہیں اُن پر روئیں اتنی بڑی زمین اس قدر طویل و عریض اور فرزند رسولؐ پر تنگ ہو جائے نہ مدینہ میں رہ سکیں نہ مکہ میں قیام فرما سکیں۔"

گویا میرے کانوں میں گونج رہی ہے مولانا مرحوم کی درد بھری آواز جوان فقرات کے ادا کرنے کے وقت سامعین کے دلوں پر نشتر کا کام کر رہی ہو گی اور آنکھوں سے آنسو اُمڈ رہے ہوں گے۔

(۸)

وہ نماز دیکھنے کے قابل تھی جس کے لئے آفتاب جا کے پلٹا۔ اُس جی کا حال نہ معلوم ہو سکا کیا اسوقت نازل ہوا تھا لیکن رسالتمآب کا اضافہ ہے یہی دعا کرنا کہ گو یا کہ خبر دیتا ہے کہ دعا کرنیکا حکم پا چکے تھے رسالتمآب اور خدا

اُسکے رد کرنے پر آمادہ تھا۔ بیٹھے تھے امیر المومنین تو آفتاب افق کے نیچے تھا اُٹھے تھے تو بلند ہو گیا۔ ہر چند کہ حق بن شان تابعیت نہ تھی مگر اُس دن تو علی امام معلوم ہوتے تھے اور آفتاب ماموم تھا جس کا اتباع اس روایت سے اظہر من الشمس ہے۔ بسپر اُس نماز کے قبول ہونیکا کیا ذکر کہ ایک کے ادا کے وقت فہرنوت کے قریب زانو تھے اور ایک کے ادا کے وقت دامن آفتاب سر پہ تھا۔

(۹)

بعد قتل امام حسین علیہ السلام آپکے اہلحرم رونے نہ پائے۔ یوں تو دل بعد وفات سرور عالم مسرور ہی کب ہوا ہوگا۔ دل رو رہا تھا۔ آنکھیں رو رہی تھیں۔ اعضا رو رہے تھے حالت رو رہی تھی اگر کربلا ہی میں لاشوں پر صف ماتم بچھتی تو جانتے کہ کوئی رونے پایا تھا۔

(۱۰)

"امام وقت بھی، رسول اللہ کی تصویر بھی حسنین بھی حسین بھی، امام بھی، مبین بھی، قرآن صامت کے حامل بھی، قرآن ناطق بھی، ان سب صفتوں کے ساتھ ساتھ ۶۱ھ میں کچھ القاب اور ضم ہوئے۔ غریب الوطن بھی، شہید بھی، امت کے فخر بھی، اُمت کے مقتول بھی، بحر علم بھی دریائے فرات کے پیاسے بھی خود تو بڑی ہنسی خوشی سے جان دی مگر تمام دنیا کو اپنے ماتم میں رلوا دیا۔ مرنے پر بھی یہ جو ہوگے جب ہم ہوئے اپنا ہی امن

بھر لیا۔

(۱۱)

خزینہ داران علم و حکمت الٰہی اُسکے دینے میں کبھی بخل نہیں کرتے تھے اور اُسکی تعلیم میں کبھی کوئی عوض نہیں چاہا بلکہ بتلانے میں اور اُن گراں بہا جواہر کے دینے میں اسقدر انہماک تھا کہ رکنے کو طبیعت ہی نہیں چاہتی تھی۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ چاندنی رات میں امیر المومنینؑ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے مجھ کو بقیع کی طرف لیگئے۔ ارشاد فرمایا اے عبد اللہ (ابن عباس) اسوقت کچھ پڑھو۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے اُن حضرت کے ارشاد سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تلاوت کی۔ آپ مجھ سے تمام رات بائے بسم اللہ کے اسرار بیان فرماتے رہے یہانتک کہ صبح طالع ہوگئی۔

شبہائے وصل میں حبیب سے تکلم کرنے کے لیے یوں عشاق کی نیند اڑتی ہوگی جیسے حرف با کے کشف اسرار پر اور اس خزانۂ عامرہ کے لٹانے کیلئے علی بن ابیطالبؑ کی نیند اڑگئی یہانتک کہ تفسیر بائے بسم اللہ کو نور ضیا صبح سے ملحق کردیا۔ ابر رحمت باری تھے۔ برس پڑنے سے کام تھا جس طرح وہ جہاں برستا ہے حصۂ نشیب میں بہ نسبت فراز زیادہ ہوتا ہے ویسا ہی منکسر مزاجان اسلام کے قلوب میں حصۂ وافر علم جگہ پاکے رہتا تھا اور متکبرین قوم مانند فراز تھے کہ اُن پر اُن کے علوم کی بوچھار پڑتی تھی اور ڈھل جاتی تھی

یہ نمونے تھے اُن مقامات کے جو "معراج الکلام" میں مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کی طبیعت سے حقیقۃً لگاؤ رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں پھر بھی جیسا کہ کتاب کے سرِ صفحہ پر لکھا گیا ہے "تاثیر زبان تو قبضہ میں آ ہی نہیں سکتی" وہ اُنہی کے لب و دہن سے مخصوص تھی اور صفحۂ کاغذ پر اُس کا آجانا غیر ممکن و محال ہے۔

تاریخ ذاکری

اس عنوان کے تحت میں ہم انکی ذاکری کی ابتدائی تاریخ اور اسکے درجہ بدرجہ منازل ترقی لکھنا چاہتے تھے لیکن افسوس ہے کہ اس جزو کو ہم اپنی ناواقفیت کی بنا پر پورے طور سے لکھ نہیں سکتے۔ ہم نے اُن کا جو زمانہ اپنے سن شعور میں دیکھا وہ عروج و شباب کمال کا زمانہ تھا اور پھر آخری زمانہ دیکھا ہمیں اُن کے ابتدائی حالات کا اندازہ کہاں ہو سکتا ہے۔

بہر حال جہاں تک سنا گیا ہے ابتدائی مجلسیں اُنکی پاٹے نالے پر انجمن جلاء الایمان کی طرف سے بنا شدہ تھیں اُن میں وہ بیان فرماتے تھے اور وہیں سے لوگوں کو اُن کے ساتھ گرویدگی پیدا ہوئی۔ یہ عجیب بات تھی کہ "اول با آخر نسبتے دارد" کے مطابق اُنکے پڑھنے کی سب سے آخری مجلس بھی انجمن جلاء الایمان پاٹا نالہ کی طرف سے ہوئی جس کے بعد پھر انھیں منبر پر جانیکا موقع نہیں ملا۔ شاید یہ مجلس انھوں نے خاص اسی لئے پڑھنے کا

وعدہ کیا کہ یہیں سے ابتدا ہوئی ہے اور یہیں انتہا ہو جائے۔

سابق زمانہ کا رنگ ذاکری حسن کا آخری نقطہ کمال جناب محقق ہندی مولانا محمد حسین صاحب قبلہ مرحوم کی ذات پر ختم ہوا ہے جناب حکیم مولوی مقبول احمد صاحب قبلہ مرحوم کے لکھنؤ میں آنے سے بدل چکا تھا۔

یعنی مولانا مقبول احمد صاحب کے بیان کے ساتھ لوگوں کی انتہائی گرویدگی و شیفتگی نے اُن کے مذاق طبع میں تبدیلی کر دی تھی اور اب وہ پرانا رنگ پسند نہ کرتے تھے۔ اس زمانہ میں مولانا سبط حسن صاحب قبلہ نے بیان کرنا شروع کیا گو کہ ابتدا میں وہ اُس معراج کمال پر نہ رہے ہوں جس پر اپنے انتہائے عروج کے زمانہ میں تھے لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ فطری خصوصیات کا اثر انسان میں ابتدا ہی سے ہوتا ہے۔ اُن کے ابتدائی ہی بیانات نے دنیا کو جذب کرنا شروع کیا اور ایک طرف مشق بیان اور کثرت مطالعہ سے اُن کے جوہر طبیعت میں جلا بڑھتی گئی اور بیان بہتر سے بہتر ہوتا گیا۔ دوسری طرف جذب و کشش میں اضافہ ہوتا گیا اور لوگوں کی گرویدگی بڑھتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا مسخر تھی اور مولانا سبط حسن صاحب اپنے بیان سے قلوب خلق پر حکومت کر رہے تھے۔ وہ بادشاہ تھے اور سب رعایا رعایا بھی ایسی کہ جس کا ہنسنا اور رونا سب بادشاہ کے قبضہ میں ہو۔

لکھنؤ میں اُنکے پڑھنے کی مجلسوں میں خاص خصوصیت شیخ علی عباس صاحب

وکیل مرحوم کے یہاں کے عشرۂ مجالس کو حاصل تھی۔

یہ مجلسیں غالباً پہلے عالیجناب یوسف حسین صاحب بیرسٹر کے یہاں ہوتی تھیں اُس کے بعد شیخ علی عباس صاحب مرحوم کے بھانجے محمد صغر صاحب کرنے لگے اور شیخ صاحب مرحوم کی کوٹھی واقع نخاری ٹولہ میں اُن کا انعقاد ہونے لگا۔

الشہر الشہد وہ مجلسیں یادگار ہوگئیں۔ کوٹھی کا وسیع صحن پہلو کا دالان۔ منبر کے سامنے کا چبوترہ اطراف میں جہاں جہاں ممکن جگہ ہو سب اس طرح سے مملو کہ زانو کے اوپر زانو اور شانہ سے متصل شانہ۔ تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ پھر دیواروں پر لوگ۔ دروازہ کی کارنس پر لوگ اور ڈیوڑھی کی اوٹ کی دیوار پر لوگ۔ گرمی اتنی سخت کہ پسینہ کی نہریں جاری۔ پنکھے چاروں طرف منتشر اور ہر شخص کا ہاتھ پنکھے کے جھلنے سے رکتا ہی نہیں اور اس دوران میں مولانا تشریف لائے۔ مجمع سے صلوات کی آواز بلند ہوئی۔ مگر لوگ آپ کو منبر تک پہونچنے کا موقع تک آسانی سے دینے کیلئے نہیں تیار اس ڈر میں کہ ہم اٹھے اور ہماری جگہ پر کسی اور نے مداخلت کی۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح آپ منبر تک پہونچے لیکن بیٹھنے کی جگہ نہیں مجبوری منبر کے پہلے زینہ پر تشریف فرما ہوئے۔ اب ہر شخص کو بے چینی سے اشتیاق کہ مولانا منبر پر تشریف لیجائیں لوگ اُبھر اُبھر کر مولانا کے چہرہ پر نظر کر رہے ہیں

اور ایک ایک سکنڈ جو گذرتا ہے طبیعت پر بار ہے۔

خدا خدا کر کے دو بجنے میں جو منٹ باقی تھے وہ ختم ہوئے۔ مولانا سبط حسن صاحب قبلہ منبر پر تشریف لے گئے۔ ابھی تک گرمی ہے پسینہ ہے، تکلیف ہے لیکن مولانا نے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم خطبہ پڑھ کے بیان شروع کیا۔ اب محویت ہے، وجد ہے، لفظ لفظ پر واہ واہ ہے، اور فقرہ فقرہ پر سبحان اللہ گرمی کا احساس نہیں پسینہ کی خبر نہیں کسی کو معلوم بھی نہیں ہے کہ جاڑا ہے یا گرمی کی شدت۔ پورا بیان اسی حالت میں ہو گیا۔ مصائب تک پہونچے۔ ربط دیا مجلس میں ہنگامہ ہو گیا۔ لیکن اشتیاق لفظوں کے سننے کا غل و شور کو باقی نہیں رکھتا۔ ہر مرتبہ سکوت و سکون ہو جاتا ہے کہ وہی لفظیں جو دہن سے نکلتی ہیں کیا ہیں لفظیں دہن کی کیا ہیں کہ تیر الم ہیں، ناوک دلدوز ہیں، دل سینہ سے جدا ہوتا اور کلیجہ مونھ کو آتا ہے۔ ہر فقرہ پر وہ شور بکا بلند ہوتا کہ دیواروں میں لرزہ پڑ جاتا ہے۔ آخر مصائب ختم ہوتے اور مجلس انتہا کو پہونچتی ہے۔ مولانا ہاتھ دعا کے لئے اُٹھاتے اور مجمع کھڑا ہو جاتا ہے اب نظر آتا ہے کہ مچھلیاں تڑپ رہی ہیں۔ کتنے لوگ ہیں کہ اُنکی ہچکیاں بندھی ہوئی ہیں کتنے ہیں کہ قریب ہے غش آجائے۔ یہ تھا اُن کا بیان اور یہ تھی اُس کی تاثیر۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ سلسلۂ بیان جاری ہے اور بارش ہونے لگی۔

بارش اتنی تیز کہ شمگیرہ روک نہیں سکتا۔ شمگیرہ میں سے پرنالے چلنے لگے اور ہر طرف سے پانی کی آمد ہو گئی۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جنکے پاس چھتریاں تھیں۔ اُنھوں نے چھتریاں لگانا چاہیں اور مولانا کے اوپر بھی چھتری کا سایہ کیا گیا لیکن آپنے اپنے اوپر سے چھتری ہٹوادی۔ ارباب مجلس کو بھی متنبہ کیا کہ چھتریاں نہ کریں۔ بات کا اثر تھا۔ ہر طرف سے چھتریاں بند ہو گئیں۔ آپنے فرمایا یہ "پانی کے قطرے ہیں کچھ تیروں کی بارش تو نہیں ہے" بس پھر کیا تھا مینھ برس رہا ہے اور یہاں شور گریہ کا بلند ہے۔ گویا آنسوؤں کا باران بارش ابر سے بڑھ گیا ہے۔

آپنے فرمایا "مجھے ابر سے شکایت ہے۔ کاش یہ ابر اُسوقت برستا جب خیمہائے اہل حرم میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ آگ خاموش ہو جاتی تو اہل حرم کا پردہ کیوں جاتا"

حقیقت یہ ہے کہ مجلس یادگار تھی۔ ایسی مجلسیں دنیا میں کم دیکھنے میں آئی ہیں شیخ علی عباس صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد کوٹھی کے ملنے میں دشواری ہوئی یا جگہ کی قلت کا احساس کیا گیا کہ یہ مجلسیں کڑہ ابو تراب خاں کے مقام عنبر باغ میں منتقل ہو گئیں۔ یہ جگہ بہت وسیع لیکن بالکل کشادہ ہے۔ وسعت اسکی اتنی زیادہ ہے کہ مجمع اسمیں باوجود انتہائی کثرت کے پھر بھی پاشان رہتا ہے اور پھر عمارت بھی نہیں ہے کہ جس میں آواز محدود ہو۔ یہاں پہونچکر ایک تو جگہ

کی حد سے زیادہ وسعت جس سے مجمع میں انتشار اور اس سے متکلم کی آواز میں بھی انتشار پیدا ہو جانا ضروری ہے یہ باعث ہوا اور دوسری طرف یہیں پہنچنے کے بعد مولانا کی قوت میں سال بسال کمی اور عوارض و امراض کی زیادتی ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ عنبر باغ آنے کے بعد پھر وہ اثر مجالس کا نہ تھا جو شیخ علی عباس صاحب مرحوم کی کوٹھی میں تھا۔

پھر بھی مجمع یہاں کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ اور وہ مجمع برابر مولانا مرحوم کی ذاکری کے آخری سال تک قائم رہا۔ برابر لوگ اتنی ہی تعداد میں شریک ہوتے اور اسی اشتیاق سے جاتے تھے اور ہر روز یہ خیال کرتے کہ دیکھیں مولانا کیا بیان فرماتے ہیں؟

مختلف رؤسا کی طرف سے بڑی کوشش ہوئی کہ کسی طرح مولانا عشرۂ محرم کے مجالس میں کہیں باہر جانا منظور فرمالیں لیکن آپ نے عشرۂ محرم میں لکھنؤ کو ترک فرمانا کبھی گوارا نہ کیا۔ ایک مرتبہ رامپور سے انتہائی اصرار ہوا تو یہ زحمت گوارا فرمائی کہ روزانہ لکھنؤ سے موٹر پر تشریف لیجاتے اور پھر لکھنؤ میں مجلس کے وقت تک پہونچکر یہاں بیان فرماتے تھے۔ آپ کو اہل لکھنؤ سے خاص محبت تھی اور اپنے بیان کے لئے اہل لکھنؤ کی نکتہ سنجی کے معترف تھے۔

اس عشرۂ مجالس کے علاوہ نواب حامد حسین خاں عرف بابو صاحب کے یہاں سٹی اسٹیشن پر۔ نواب سکندر آغا صاحب کے یہاں کٹرہ ابو تراب خاں میں،

مرزا محمد جعفر صاحب و مرزا محمد صادق صاحب کے یہاں امام باڑہ ناظم صاحب میں۔
علی مہدی صاحب کے یہاں کاظمین میں۔ جناب مولانا سید احمد صاحب ابن جناب
عمدۃ العلما مولانا سید محمد ہادی صاحب قبلہ کے یہاں کٹرہ میں، جناب نجم الملۃ
مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ کے یہاں آٹھویں تاریخ ربیع الاول کی جناب رانی
صاحبہ محمود آباد کے یہاں اقبال منزل میں اور بہت متفرق مقامات پر مجالس
میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر مجلسیں آن کے ضعف و اضمحلال
اور ابتلائے امراض کے بعد دوسرے حضرات کے سپرد کر دی گئیں تھیں مگر پھر
بھی عنبر باغ کے مجالس اور جناب نجم الملۃ مدظلہ اور علی مہدی صاحب کے یہاں
اور بعض مقامات کی مجلسیں انھوں نے سال گذشتہ تک پڑھی تھیں اور صرف
اِنکی کا زمانہ عزا انقاجہ بالکل انکے بیانات سے خالی رہا اور آج عوض اس کے
کہ انکی زبان سے تذکرہ مصیبت سنیں خود انکے مصیبت ارتحال میں مبتلا اور
خود اُن کے تذکروں کو بطور افسانۂ ماضی کے سن رہے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
باہر کے مقامات میں ٹینہ عظیم آباد حسین آباد شیخپورہ۔ مظفر پور رسلیم پور
وغیرہ میں اکثر رؤسا کے یہاں کے عشرے اور مختلف مجالس میں جاکر بیان
فرمایا ہے فیض آباد کے سالانہ تبلیغی مجالس میں جب سے کہ وہ مجالس قائم ہوئے
ہیں جانا شروع کیا اور جو عہد کیا تھا کہ اپنی زندگی بھر آؤں گا اُسکو پورا کیا کر
گذشتہ جلسوں تک برابر شرکت فرمائی اور باوجود اپنے انتہائی ضعف و اضمحلال

کے پھر بھی ایک مجلس میں بیان فرمایا۔

اسی طرح آگرہ کے مزار شہید ثالث کے مجالس میں برابر شرکت فرمائی اور اب کی بالکل آخری اپنے زندگی کے دور میں تشریف لیگئے اور ایک مجلس میں بیان کیا۔

حیدر آباد میں ایک مرتبہ خاص طور سے مدعو تھے۔ حضور نظام نے اُن کا بیان سنا اور انتہا سے زیادہ پسند کیا۔ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو بعد میں نہ معلوم کن غلط فہمیوں کی بنا پر بند ہو گیا۔

آپ کی بے نظیر شہرت سے متاثر ہو کر ۱۳۴۲ھ میں طلبائے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے آپ کو اپنے یہاں دعوت دی اور ۲۸ جنوری کو مجلس منعقد ہوئی۔

آپ کا بیان علی العموم دل آزار نہیں ہوتا تھا اور خصوصیت سے اس مجلس میں تو اُن کو احساس تھا کہ مجمع مشترک ہے مگر مدح اہلبیت ایسی چیز نہیں ہے جو مسلمانوں کے کسی طبقہ کے لئے دل آزار سمجھی جا سکے۔

مرحوم نے الحسن والحسین سیدا شباب اھل الجنۃ کی حدیث سے عنوان کلام قرار دیا اور دو گھنٹہ تک وہ علمی و ادبی نکات بیان فرمائے جس پر تمام مجمع نے استحسان کا اظہار کیا اور خصوصیت کیساتھ یونیورسٹی کے ذمہ دار افراد نے تقریر کی کامیابی کا اعتراف کیا۔

لیکن بعض متعصب اور تنگ نظر افراد کو یہ امر گوارا نہ ہوا اور اُنھوں نے

مولانا مرحوم کے خلاف ایک طوفان مخالفت برپا کیا اور آپ کی تقریر کو وہ وانا
حیثیت دیتے ہوئے فتنہ وفساد کی آگ مشتعل کی اور اسی سلسلہ میں مولانا
مرحوم کی شان میں ایسے الفاظ استعمال کئے جو تہذیب وشائستگی کے
خلاف تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ شیعوں میں خود اپنے کالج قائم کرنے کا احساس
پیدا ہوا اور آخر اس شیعہ کالج کی بنیاد قائم ہوگئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں
کہ شیعہ کالج کے قائم ہونے میں مولانا موصوف کے ذات کو بہت بڑا دخل حاصل تھا
مختصر حقیقت امر یہ ہے کہ اس فن یعنی ذاکری میں جتنی ترقی انھوں نے
حاصل کی اتنی آج تک کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہوئی ہے آیندہ
کی خبر خدا کو مگر آثار سے یہ توقع نہیں پیدا ہوتی کہ اسکی نظیر کوئی دوسری
ہماری آنکھوں کو نظر آسکے۔

تلامذہ

مجھے اسوقت اُن لوگوں سے مطلب نہیں ہے کہ جنھوں نے منطق فلسفہ
کلام یا علم ادب کی تحصیل اُن سے کی۔ اگرچہ ایسے لوگوں کی تعداد
بھی بہت ہے لیکن میرا مطلب تو اُن لوگوں سے ہے کہ جنھوں نے فن ذاکری میں
اُن سے تلمذ اختیار کیا۔ یوں تو یہ واقعہ ہے کہ ادھر مولانا مرحوم نے ذاکری
شروع کی اور لوگوں نے پسند کیا اُدھر ایک زمانہ آپکے تتبع وتقلید یا دوسری
لفظوں میں نقالی پر آمادہ ہوگیا۔ جو ذرا عربی علم کا جاننے والا ہوا وہ منبر پر گیا
اور اعوذ باللہ کہکر شروع کردیا سنبھل سنبھل کر اپنے حتی الامکان الفاظ کو سجاکر

پڑھنا شروع کر دیا اور کچھ نہیں تو "صحن عالم" کی لفظ اُس نے ضرور کہدی اور سمجھ لیا کہ بس مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کے بیان کا میں نے چربہ اُتار لیا اُن میں سے کچھ لوگوں کو جو ذوق سلیم کی نعمت سے محروم تھے چند ہی روز میں ناکامیابی کا موںھ دیکھنا پڑا اور کچھ لوگ جو خدا کی طرف سے ذوق سلیم لیکر آئے تھے انھوں نے اپنی ذاتی سنجیدگی طبع سے ترقی بھی کی اور چاہے کوئی زبان سے نہ کہے لیکن حقیقۃً مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کی شاگردی یعنی تتبع ہی نے انکو درجۂ بلند پر فائز کیا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسوقت کے جتنے واعظین ہیں اُن میں سے اکثر مولانا کے تلامذہ ہیں اور اُن کے متبع دوسری حیثیت سے ظاہر ہے کہ مولانا موصوف کوئی لہجہ خاص رکھتے نہ تھے کہ لہجہ اپنا کسی کو بتلاتے، مرثیہ کیطرح کوئی خاص سبج دہج منظور اصلی نہ تھی کہ وہ اُس طرح سے شاگرد کو تیار کرتے۔ وہ تو چیز ایسی تھی کہ علم و فضل ہو اور خدا کی طرف سے وہ حسن بیان کا جوہر عطا ہو تب خود ہی پیدا ہو سکتا تھا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اس فن خاص میں انکی شاگردی کے کوئی معنی ہی نہیں لیکن ہمارا مقصود تلامذہ کے ذیل میں اُن لوگوں کا تذکرہ کرنا ہے جنھوں نے مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کا تتبع کیا اور وہ اپنے کو منسوب بھی آپ ہی کی جانب فرماتے تھے۔

ان میں ممتاز ہستی جو ہماری نظر میں قابل تذکرہ ہے وہ جناب مولانا سید وجاہت حسین عرف ناظم صاحب قبلہ مرحوم کی ہے انھوں نے مولانا سبط حسن صاحب قبلہ

کا رنگ اختیار کیا اور چونکہ قدرت نے علم و فضل کے ساتھ ذہانت و ذکاوت، حسن طبع، مناسبت، مزاج، ذوق ادب صحت تخئیل اور مذاق شاعری سب بہترین طریقہ سے اُن میں ودیعت کیا تھا اور یہی چیزیں اس رنگ ذاکری کی جان و روح ہیں اسلئے وہ اس رنگ کے پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے آواز انکی بیشک چھوٹی تھی اور بڑی مجلس میں حاوی نہوتی تھی ورنہ باعتبار مطالب، نکات و مضامین حسن بیان و لطف تقریر اُن کو پورے طور سے پسند کر لیا گیا تھا۔ اور اُن کی عمر نے وفا نہیں کی اور موقع اُن کو نہیں ملا ورنہ مولانا مرحوم کے صحیح قائم مقام ہو سکتے تھے۔

دوسری ہستی جناب مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کے برادر عزیز ابوالبراعۃ مولانا سید ظفر مہدی صاحب قبلہ مدیر سہیل یمن کی ہے۔ آپنے بچپنے سے مولانا مرحوم کے زیر نظر تربیت پائی اور موصوف ہی کی تعلیم سے فیض حاصل کیا اسلئے ایک طرف قرب نسب و اتحاد صلب و بطن، اور دوسری طرف رشتہ تربیت و فیض صحبت سے آپ کی طبیعت مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کی طبیعت کے سانچہ میں ڈھل گئی اور پھر قدرت نے آپ کو خود علم و فضل کے ساتھ وہ تمام جوہر مرحمت فرمائے ہیں جو اس کمال فن کے لئے ضروری ہیں۔ آپ کا پڑھنا بھی مولانا مرحوم کے پڑھنے سے انتہائی مشابہ ہے اور آپکے ذہن میں تمام وہ نکات و مضامین راسخ بھی ہیں جو مولانا مرحوم نے بیان فرمائے تھے اور آپ کی طبیعت میں

خود پیدا وار اور نکات و مطالب کے استنباط کرنیکا ملکہ بھی ہے۔ زبان شگفتہ ہی تقریر میں حسن و لطافت ہے طبیعت میں شاعرانہ تخیل ہے اس سب کی بنا پر آپ اسوقت مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کے صحیح جانشین و قائمقام سمجھے جا سکتے ہیں۔ افراد ملت کو چاہیئے کہ وہ مولانا کو مجبور کریں اور مولانا کو چاہیئے کہ وہ خود توجہ فرمائیں کہ مولانا مرحوم کے انتقال کی وجہ سے جو نقصان عزاداری حضرت سید الشہداء کو پہونچا ہے اسکی ایک حد تک تلافی مولانا کے بیانات سے ہو جائے۔

امراض و عوارض

مولانا مرحوم کے اعتدال مزاج کو سب سے پہلا دھچکا وہ پہونچا جو زہر کی طرف منسوب ہے۔ اسکے بعد تقریباً ۱۳۴۷ھ میں آپ کو سخت ترین عارضہ ایک پیدا ہوا جس میں ایک مرتبہ آپ کو سکوت کا عالم ہو گیا۔ مشاہیر اطبا کو تشخیص مرض میں دشواری ہوئی اکثر حضرات نے صراحۃً یہ خیال ظاہر فرمایا کہ یہ مرض دفع نہیں ہو سکتا۔ بہرحال لکھنؤ کے نامور طبیب جناب حکیم سید محمد تقی عرف مجن صاحب مرحوم نے کامیاب اور معرکۃ الآراء علاج کیا جس سے وہ کیفیت دور ہوئی اور مرحوم اس لائق ہو گئے کہ ذکر حضرت سید الشہداء کا سلسلہ جاری رکھیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مرض نے آپ کی طاقت پر بڑا غیر معمولی اثر

ڈال دیا تھا جس کے آثار برابر باقی رہے اور آخر عمر میں تو آپ مجمع عوارض ہو گئے
طبیعت کی بالیدگی۔ خوش طبعی۔ حاضر جوابی شگفتہ مزاجی۔ وغیرہ سب رخصت
ہو گئی تھی۔ جو لوگ آپ کی اس سابق زمانہ میں ملاقات سے بہرہ اندوز ہو چکے
تھے وہ اب اس آخری زمانہ میں آپ کو دیکھکر تکلیف محسوس کرتے تھے لیکن وہ
خلوص اور خدمت حضرت سید الشہداء کے ساتھ والہانہ وابستگی تھی جس نے
آپ سے اس خدمت کو اس وقت تک ترک نہونے دیا جبتک کہ مرض نے بالکل
صاحب فراش نہ کر دیا یہانتک کہ انتقال کے ایک مہینہ قبل تک آگرہ کی مجلس
میں پڑھنے تشریف لیگئے اور سب سے آخر میں "جلاء الایمان" کی محفل پڑھی ذی الحجہ
کے آخری ہفتہ میں مرض نے پوری شدت کے ساتھ حملہ کیا اور وہ صاحب فراش ہو گئے۔
اطبا نے علاج میں پوری کوشش کی مگر بے سود۔ مرض کی شدت میں
اضافہ ہی ہوتا گیا آخر میں اعضا و جوارح بھی معطل ہو گئے تھے اور چند روز
اس طرح گذرے کہ آب و غذا اور دوا تک حلق کے نیچے نہیں اتری۔

حادثہ عظمی یعنی انتقال پر ملال

۲۸ محرم ۱۳۵۴ھ روز پنجشنبہ کی صبح کو اس مجاہد ملت خطیب آل محمدؐ
نے دنیا کو خیرباد کہا۔ آپ کے انتقال کی خبر بجلی کی طرح شہر بھر میں دوڑ گئی
اور لکھنؤ کے زمین زلزلہ سے متحرک ہو گئی۔ اخبار سرفراز لکھنؤ مورخہ یکم صفر مطابق

۵ رمئی ۱۹۳۵ء میں مرحوم کی تجہیز و تکفین کے حالات جو شایع ہوئے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

ان سے اندازہ ہوگا کہ اہل لکھنؤ نے اپنے اس مایۂ ناز مجاہد کو کس اخلاص و عقیدت کے ساتھ رخصت کیا:-

سلطان الذاکرین کا وداعی جلوس

پنجشنبہ ۲ رمئی ۳۵ء کو ۸ بجے صبح کے وقت سلطان الذاکرین شمس العلماء حضرت مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے رحلت فرمائی لیکن چونکہ بیرونجات کے اعزاء و مومنین کا انتظار مناسب تھا اسلئے میت ۳ بجے دن کو مکان سے دریائے گومتی پر بغرض غسل و کفن روانہ ہوئی۔ اگرچہ دھوپ شدید تھی لیکن مومنین شہر جوق جوق آکر شریک جلوس میت ہونے لگے ہزاروں آدمیوں کا یہ مجمع اپنے درمیان میں اپنے ہر دلعزیز و محترم عالم و ذاکر کا تابوت لئے ہوئے آہستہ آہستہ رواں تھا۔ مومنین کی دلدوز آہ و بکا کے سوا مجمع پر غم انگیز خاموشی طاری تھی۔ تابوت کے آگے سیاہ علم اور علم کے ساتھ ساتھ ایک نقیب آواز بلند چند ایسے جگر خراش لیکن ترجمان حقیقت اشعار پڑھتا ہوا جا رہا تھا جو اس مجمع کے لئے فی البدیہہ کہے گئے تھے اور جس میں ادس درد و الم کا اظہار کیا گیا تھا جو عزاداران امام اور مومنین و مخلصین کے دلوں میں

اس سلطان الواعظین کی ناگہانی جدائی کی وجہ سے محسوس ہو رہے تھے اس جلوس پر ایسا رنج و غم کا عالم طاری تھا کہ سورہ رحمان اور فقرہ ربانی ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ بھی ہجراں نصیب مومنین کے لئے مرثیہ کا کام کر رہا تھا ۔ جلوس جیسے جیسے دریا کی طرف بڑھتا گیا مجمع میں اضافہ ہوتا گیا ۔ ریلی کے پل کے قریب دریا کے کنارے خیمہ و فرش کا پہلے ہی سے معقول انتظام تھا ۔ پہونچکر میت کو غسل دیا جانے لگا غسل و کفن کا سلسلہ سات بجے شام تک قائم رہا ۔ اس عرصہ میں شہر و بیرونجات کے اور مومنین بھی مجتمع ہو گئے ۔ دریا کے کنارے مجمع اتنا بڑھ گیا کہ وسعت ساحل تنگ نظر آنے لگی سڑک پر موٹروں گاڑیوں کا الگ ہجوم تھا ، تمام عمائد و روساء شہر تشریف لائے تھے بعد غسل و کفن تابوت امام باڑہ غفران مآب اعلی اللہ مقامہ کی طرف روانہ ہوئی ۔ تابوت کو مومنین نے کاندھے پر لے لیا ۔ خوشبوئیں سلگا دی گئیں ۔ علم کے سیاہ و سبز پھریرے کھول دیئے گئے ۔ دو رویہ گیس کے کثیر التعداد ہنڈے روشن کر دیئے گئے اور سوگواران ذاکر حسینؑ اس شام کے سناٹے میں آہستہ آہستہ روانہ ہوئے شام کا وقت دریا کا کنارہ علمائے کرام کا ساتھ ، سادات کا مجمع مومنین کا برہنہ سر و نالہ کناں ہونا یہ تمام باتیں کربلا کی اوس شام غریباں کا منظر یاد دلا رہی تھیں جو عاشور کا قیامت خیز دن ختم کر کے ظاہر ہوئی تھی ۔ جب نقیب درد انگیز لہجہ میں یہ صدا بلند کرتے تھے کہ " جناب مولوی سبط حسن کا یہ جنازہ ہے "

تو ہزار ہا شرکا جلوس کے دل جو اُس نام کی عظمت سے اچھی طرح واقف تھے بجائے خود محسوس کرنے لگتے تھے کہ ذاکر حسینؑ کی اس شام فراق کو کربلا کی شام غریباں سے ایک باطنی ربط ایک روحانی تعلق ضرور حاصل ہے میت کے پیچھے پیچھے حضرت مولانائے مغفور کے صاحبزادگان و برادران کا شیون و شین اور خاصکر جناب مولانا سید ظفر مہدی صاحب گہر کا حال تباہ حاضرین سے دیکھا نہیں جاتا تھا دل پاش پاش ہو رہے تھے۔ جلوس میت جس راستے سے دریا تک گیا تھا اسی راستے سے یعنی میڈیکل کالج کی سڑک سے واپس آیا۔ واپسی میں مجمع بیس پچیس ہزار سے کم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ رائے بریلی اور دیگر مقامات سے مومنین کے پہونچ جانے کی وجہ سے بھی مجمع میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دور تک سر ہی سر نظر آتے تھے اور دو گھنٹے تک اس راستے سے یکے ٹانگوں کی آمد و رفت ناممکن ہو گئی تھی ہر شخص کوشش کرتا تھا کہ تابوت کو کاندھا دینے کا شرف حاصل کرے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ راستے کی معمولی مسافت دو ڈھائی گھنٹوں میں ختم ہوئی اور رفتہ رفتہ جنازہ پرانی منڈی کے پاس پہونچا لیکن یہاں پہونچتے پہونچتے معلوم ہوا کہ امام باڑہ غفرانمآب میں ابھی سے اتنے زیادہ آدمی بھر گئے ہیں کہ امام باڑہ غفرانمآب میں پورا مجمع نماز جنازہ ادا نہ کر سکے گا۔ ذمہ دار حضرات کو مقام نماز کے متعلق رائے بدلنا پڑی اور یہ طے پایا کہ قریب کے وسیع

کمپنی باغ میں نماز جنازہ ادا کی جائے جلوس کا رخ کمپنی باغ کی طرف موڑا گیا
اور تھوڑی دیر میں کمپنی باغ کا دامن مومنین و مخلصین سے بھر گیا یقین کیا
جاتا ہے کہ اس باغ میں ایسی عظیم الشان نماز جنازہ آج تک نہ پڑھی گئی ہوگی
حضرت قبلہ و کعبہ نجم الملت والدین مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ دام
ظلہ العالی نے قیادت فرمائی اور نماز جنازہ بحسن و خوبی انجام پائی بعد نماز جلوس
میت حسینیہ غفرآنمآب تک اسی اہتمام سے لایا گیا۔ امام باڑے کے وسیع
صحن میں کل مجمع کو جگہ نہ مل سکی۔ اور لوگ کثیر تعداد میں امام باڑے کے
باہر ہی رہ گئے۔ امام باڑے میں تابوت رکھکر ایک مجلس غم برپا کی گئی اور
کربلا کے اسی شہید اعظم کے حالات بیان کئے گئے جس کے نام سے ہمارے
اس تابوت کی زبان سب سے زیادہ مانوس تھی۔ تقریباً گیارہ بجے شب میں
ذکر حسینؑ کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے ذاکر حسینؑ کا وہ نورانی جسم جو سارے
ملک کے لئے منبر رسولؐ پر مرکز زیارت بنجاتا تھا سپرد لحد کر دیا گیا، ذاکری کا
آفتاب غروب ہو گیا خوش بیانی کا چاند ڈوب گیا شیعوں کا سب سے بڑا واعظ
سب سے بڑا شیوا بیان سب سے بڑا خطیب سب سے بڑا مقرر کنج لحد میں خاموش ہو رہا اس کا
متبرک جسم نگاہوں سے اوجھل ہے خاک کے وزنی پردے درمیان میں حائل
ہیں قبر کا بیرونی احول خوشبوؤں سے معمور ہے اور سرہانے ربنج فصاحت
خاک بسر نوحہ کناں بیٹھی ہوئی ہے علم و ادب کی دنیا میں اس عالم جلیل اس

ادیب کامل کا ماتم مدتوں برپا رہیگا اور خوش بیانی کی محفلیں سونی نظر آئیں گی لیکن خود وہ کیا پوچھنا اُس کی روح پاک اور اُس کے اعلیٰ درجات کا، طوبیٰ کا سایہ ہوگا کوثر کا کنارہ ہوگا۔ نعمات الٰہیہ ہوں گے وہ ہوگا اور خدمت حسینؑ فدا ہوں جائیں ہماری اس شرف پر اور ایسے صاحبان شرف پر"

حادثۂ انتقال کا عام اثر

اُن کے انتقال کا جو ہمہ گیر اثر ظاہر ہوا ہے اس کا احاطۂ تحریر میں آنا بہت دشوار ہے لکھنؤ میں ان کے فاتحہ خوانی کی اس کثرت سے مجلسیں ہوئیں جن کا شمار مشکل، پھر بیرونجات میں کوئی مقام کم ایسا ہوگا جہاں اُنکی وفات کے سلسلہ میں جلسہ ومجلس کا انعقاد نہوا ہو۔ اُن مقامات کی فہرست بہت طولانی ہے اور نہ اُس کے شمار کرنے سے کوئی نتیجہ ہے عراق عرب کے مرکز اسلامی نجف اشرف تک میں اُنکی فاتحہ خوانی ہوئی اور اظہار رنج وغم کیا گیا۔

غیر شیعہ حلقوں نے بھی اُنکے کمالات کا اعتراف کیا اور اظہار رنج وملال کیا، اسلامی دنیا نے ثابت کیا کہ وہ با احساس ہے اور کمال کی قدر شناس اس سلسلہ میں "جماعت قادیان" کی طرف سے جو بیان شائع ہوا

وہ درج ذیل ہے۔ دسہ فراز مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء

جماعت قادیان کی طرف سے تجویز تعزیت

یوں تو کسی انسان کے پیدا ہونے کی دلیل ہی یہ ہے کہ اب اسکے فنا ہونے کے دن قریب آگئے ہیں لیکن ہر جماعت کے کسی عالم کی جدائی اپنے اندر ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، مولانا کی قبل از وقت موت رحلت اور دائمی جدائی بیحد قابل افسوس ہے۔

علامہ ایک بلند پایہ مقرر۔ وسیع النظر عالم عدیم المثال ذاکر حسین ہونے کے علاوہ بہت خلیق اور مذہبی رواداری کا مجسمہ تھے اور ہم نے یہ بات ذاتی طور پر کئی مرتبہ خود باریاب ہو کر محسوس کی۔ سیرۃ النبی کے ابتدائی جلوس میں جماعت احمدیہ لکھنؤ نے جب آپ کی خدمت میں تقریر کی درخواست کی تو جناب نے انتہائی رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے ہماری جلسہ میں اسوۃ الرسول پر ایک پرمغز اور عالمانہ تقریر کی اور صحیح معنوں میں اپنے آپکو ایک مذہبی پیشوا ہونے کا ثبوت پیش کیا۔ جماعت احمدیہ لکھنؤ آپ کی وفات پر اپنے دلی افسوس کا اظہار کرتی ہے۔ اور آپ کے پسماندگان کے ساتھ اس غم میں مساویانہ شریک ہے خداتعالیٰ آپکے اعزا اور احباب کو صبر جمیل عطا فرمائے

خاکسار۔ پریزیڈنٹ جماعت احمدیہ لکھنؤ

تواریخ و مراثی

شاعری احساس ہے اس لئے اس غیر معمولی حادثہ پر شعراء جس قدر بھی تاثر کا اظہار کریں وہ کم ہے۔

مولانا مرحوم کے انتقال کے سلسلہ میں اس کثرت سے قطعات تاریخ اور مراثی نظم ہوئے کہ اُن کا درج کرنا یہاں غیر ممکن ہے۔ بعض مخصوص تاریخیں اور مراثی یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱)

از عالیجناب ڈپٹی سید احمد علی صاحب خان بہادر (پٹنہ)

چرا نہ گریہ کنم بر جفائے چرخ ایدوں | چرا نہ نالم زغم از خلائے دہر اکنوں

ہزار حیف کہ ہندوستاں شدہ خالی | ز ذات سب بے ہمتا و مقدس و عالی

چہ واعظ متبحر کہ بود عذب بیاں | چہ ذاکر متفرد کہ بود رطب لساں

دریگانۂ درج صفا و ناز جہاں | مہ منور برج ذکا و فخر زماں

ادیب ذی خطر لیاقت فدائے دین ہدا | خطیب بحر صفات محب آل عبا

نہ ثانیش بہ فصاحت نہ در کلام عدیل | نہ ہمسرش بہ بلاغت نہ در کمال مثیل

ز رحلتش شدہ ہیہات سینہ ہا پُر غم | بہ فرقتش شدہ افسوس دیدہ ہا پُر نم

بزمرۂ علماء ہدیٰ اے جوش مس — علیم گفتہ کہ اے وا غروب شمس شدہ"

ازیں مقال شدہ سال عیسوی پیدا — سنین فصلی و ہجری جو خواستم یکجا ۱۹۳۵

ملک بعون احد گفتہ احد اش عن — پیش بوالحسن آمد بخلد سبط حسن

۱۳۴۱ + ۱ = ۱۳۴۲ ف

۱۳۴۱ + ۱۳ = ۱۳۵۴ ھ

بطرز عام بگو سال فوت اے غمگیں

"مقیم مجلس سبط نبی بخلد بریں"

۱۳۵۴ ھ

---

(۴)

از عالیجناب یونس صاحب زیدپوری

جز حی لایموت دوام و بقا کرا — رہگیر و ہر دو اند چہ یوسف چہ کارواں

از بہر ہر دو ذائقہ تلخی اجل — بر خوان روزگار چہ مہماں چہ میزباں

دلدادۂ حیات چو من در جہاں مجو — نگرفتہ عبرتے ز فنائے گذشتگاں

از خواب غفلتم کہ کند ہوشیار آہ — بیدار بخت واعظ ز رفت ز جہاں

یکتائے عصر سبط حسن اہل علم و فضل — خوش فکر خوش خصال خوش اعمال خوش بیاں

یونس برائے سال وفاتش رقم نمود

عالم وحید سبط حسن خلد آشیاں

۱۳۵۴ھ

ولہ

ذوبحرین

مولوی سبط حسن اہل کمال — رفت در بزم رسولِ دو جہاں

نکتہ داں نکتہ رس و نکتہ پسند — اہل فضل اہل سخن اہل زباں

صاحب علم و عمل عبد خدا — واعظ نامی و یکتائے جہاں

حسب ارشاد احبائے کرام — یونس کم مایہ درج بیاں

گفت برجستہ سپئے سال وفات

شد رواں سبط حسن سمت جناں

۱۳۵۴ھ

(۳)

از عالیجناب مولانا ابو البیان سلیم جرولی

سرتاج فن ذاکری سرخیل دین جعفری — سرجوش جام کوثری معراج سردار جہاں

زینت دہ بزم ادب ذاتش خطیب منتخب ۔ مقبول صفت تخیل لقب جادو رقم معجز بیاں
ہمچوں فرزدق محترم بزم عزا را محتشم ۔ فخر عرب رشک عجم نازد برو ہندوستاں
مطبوع بزم خاص و عام خورشید اوج احترام ۔ سلطان اقلیم کلام غالب بفوج دشمناں
خوش باطن و ہم خوبرو تا یافت ہمراہ او ۔ در بزم قوت گفتگو گوہرفشاں رطب اللساں
علمش ز لطف کردگار دریائے ناپیدہ کنار ۔ فہمش ز حسب مشیتش چابک مانند برق ضوفشاں
مملو ز علمش سینہ اش الفاظ گنجینہ اش ۔ دل از صفا آئینہ اش صورت کش راز نہاں
حیف آن مہ کمال نا وقت آمد از زوال ۔ آلودہ گرد ملال ہر اہل ملت بیگماں
حیف آخر ماہ عزا شد آخر روز بقا ۔ در الفت شاہ ہدا بر فرش ماتم داد جاں
در بزم منبر سوگوار ہر اہل ماتم بیقرار ۔ ہمراہ میت می ہزار نوحہ کناں بہر دعاں
روحش بنزد بوتراب جسمش بمرقد صرف خواب ۔ ہم مسکن غفراں مآب تا روز محشر میہماں

بنوشت با حال سقیم تاریخ در ہجری سلیم
سبط حسن فرو جہاں در بزم سردار جناں

۱۳ ھ ۵ ۴

(۴)

از عالیجناب سید محمد حسن صاحب احسن طباطبائی بی اے آنرس۔ ایم اے۔

واعظ معجز بیاں اے مولوی سبط حسن
آپ کے اٹھنے سے سونی ہے ہماری انجمن

صاف کہئے لکھنؤ والوں سے ناخوش تو نہیں
کس لئے کنج لحد میں ہوگئے گوشہ نشیں

آپ کا زور بیاں اک معجزہ تھا معجزہ
دلکشی الفاظ میں بے مثل تھا طرز ادا

آپ کی تیغ زباں میں تھی نمود ذوالفقار
دشمنان آل احمد جس سے ہوتے تھے فگار

آپ بنتے تھے ہمیشہ قوم و ملت کی سپر
نرغۂ اعدا میں اب ہم آپکو ڈھونڈیں کدھر

غلغلہ ہے آپ کے ماتم کا اب ہر شہر میں
کارنامے آپ کے تازہ رہینگے دہر میں

ذاکری میں طرز نو کے آپ بانی ہوگئے
ذاکر شبیر بنکر غیر فانی ہوگئے

خوش بیانی کر گئے اور گل فشانی کر گئے
سچ تو یہ ہے زیب منبر کامرانی کر گئے

۲

ہوگیا خاموش افسوس وہ معجز بیاں
بے پنہ تھی بہر اعدا جس کی شمشیر زباں

جسکو سننے کی سدا مشتاق تھی خلق خدا
حشر تک کے واسطے افسوس وہ چپ ہوگیا

مالک ملک فصاحت وہ بلیغ نکتہ رس
جسکی ہر ہر بات سننے کی تھی دنیا کو ہوس

وہ محدث وہ ادیب عصر وہ تاریخ داں
ہو گیا صد حیف مشتاقوں کی نظروں سے نہاں

کربلا والوں کا ماتم تھا سدا جس کا شعار
اس کے غم میں آج ہیں ہم سب کی آنکھیں اشکبار

رحم کر ہم بیکسوں پر خالق عز و جل
مرنے والے کا عطا کر دے ہمیں نعم البدل

کھا گئی احسن خطیب قوم کو کس کی نظر
الحذر اے گردش چرخ ستمگر الحذر

(۵)

از عالیجناب سید محمد عسکری صاحب طباطبائی بی اے

کون جنت کا مسافر وہ عدم کا راہرو
جس کے رخ سے ہے نمایاں نور ایمانی کی ضو

جس کے سر پر چتر زریں ہے کمال علم کا
جس کا سینہ آئینہ خانہ جمال علم کا

راہ میں ہو گا۔ ابھی چھوٹا ہے بستی کا چمن
ہادی دین رہنمائے گمرہاں سبط حسن

عرض کر دینا مری جانب سے بعد سلام
سر جھکا کر دست بستہ با ہزاراں احترام

اے خطیب ملک و ملت اے ادیب روزگار
نطق کے معجز نما تخئیل کے پروردگار

مالک ملک فصاحت، قادر علم کلام
اے کلیم طور منبر واعظ سدرہ مقام

یوسف کنعان معنی، خسرو حسن ادا
نو بنو طرزوں کے موجد جدتوں کے پادشا

نکتہ سنج و نکتہ پرور ذاکر آل رسولؐ
خوشنوا خوش لہجہ خوشگو بلبل باغ بتولؑ

کارنامے نقش ہیں اوراقِ ہستی پر ترے
مدحِ اہلبیت کا سہرا رہا ہی سر ترے

کروٹیں لیتا تھا دل ہر لفظ پر تاثیر پر
خود فصاحت غش تھی تیری شوخیٔ تقریر پر

سحر آگیں کسقدر تھی ندرت گفتار بھی
جس کے آگے سر جھکاتے تھے در و دیوار بھی

جب سرِ منبر تو وعظ جانفزا دینے لگا
ایک اک ذرہ صدائے مرحبا دینے لگا

تو نے کچھ اسطرح دکھلائے زباندانی کے طور
بلبلیں سب لے اڑیں تیری خوش الحانی کے طور

دوسروں کے حق میں تو خضرِ طریقت بن گیا
تیرا ہر نقشِ قدم شمعِ ہدایت بن گیا

اُف ترا زورِ بیاں اُف تیری گویائی کی تاب
آسمانِ عظمت کے اے درخشاں آفتاب

وہ مقصودِ شیوۂ رنگیں بیانی یاد ہے
یاد ہے اب تک تری شیریں زبانی یاد ہے

بات کیا ہی سچ بتا کیوں یک بیک چپ ہو گیا
دل کئے دیتی ہے ٹکڑے یہ خموشی کی ادا

کچھ لب فرقت سے زرا شاہدِ خلوت نشیں
کس خطا پر ہم پرستاروں سے آنکھیں پھیر لیں

وعظ تیرا پردۂ حائل حق و باطل میں تھا
علم کا تیرے اجالا ہر نظر ہر دل میں تھا

تیرے چھپنے سے اندھیرا قوم کی محفل میں ہے
چودھویں کے چاند اب تو کونسی منزل میں ہے

تیری ہر ہر بات جنت کا شگفتہ پھول تھی
آجتک خوشبو مشامِ جاں میں ہے جسکی بسی

تیرا ہر کلمہ مئے توحید کا پیمانہ تھا
رند بادہ کش تھے ہم تو ساقیٔ میخانہ تھا

میکدہ ویراں ہوا ہر شیشۂ دل چور ہے
رند ساقی سے چھٹے رندوں سے ساقی دور ہے

ہے چمن زار طلاقت پر خزاں چھائی ہوئی
ہر کلی بکسی ہوئی ہر شاخ مرجھائی ہوئی

پھول کیا کوئی چنے حسنِ بیاں جب اٹھ گیا
لطف گلگشت چمن کیا باغباں جب اٹھ گیا

خشک ہے اک اک نہال ایک اک بوٹا زرد ہے ‎ جانِ گلشن اب نہیں بازارِ گلشن سرد ہے

انجم پردیں تھے ہم اور تو ہمارا چاند تھا ‎ چاند بھی تیری ضیائے رخ کے آگے ماند تھا

حوصلے ٹھنڈے ہوئے سردار لشکر چھن گیا ‎ انجم و پردیں سے ماہ نور گستر چھن گیا

پہلوئے درد آشنا میں اب وجود دل نہیں ‎ ہے وہی محفل مگر وہ رونقِ محفل نہیں

زاہد و مرتاض تھا، انجام بہتر ہو گیا ‎ رات کا جاگا ہوا تھا صبح ہوتے سو گیا

بوترابی تھا ادائے خاکساری بھا گئی ‎ چادرِ خاک اوڑھلی سکھ پا گیا۔ نیند آگئی

شک بھی کیا ہے تجھ پہ جسم و نشتر و دار و گیر کا ‎ لب پہ نام اللہ کا اور دل میں غم شبیر کا

ہاتھ دونوں آئینہ تھے تیرے دل کے حال کا ‎ اک میں قرآں، ایک میں دامن نبی کی آل کا

تیرا مشرب حق نمائی، حق روی، حق پرسی ‎ سر میں سودائے محمد دل میں عشق حیدری

نامۂ اعمال کچھ اشکوں سے ایسا دھل گیا ‎ پیشوائی کی تری خود باب جنت کھل گیا

اب تو دربار حسینی میں اجازت مل گئی ‎ جس کی مدت سے تمنا تھی وہ دولت مل گئی

دیدیا شبیر کا پرسا ہر اک ذی جاہ کو ‎ باپ کو، بھائی کو، ماں کو اور رسول اللہ کو

پائے عباس جری پر خوب ہی آنکھیں ملیں ‎ خوب جی بھر کر بلائیں اکبر مہ رو کی لیں

ہاتھ چومے، کی زیارت قاسم گلفام کی ‎ لاج رکھ لی جس نے دنیا میں حسن کے نام کی

ہوں مبارک تجھ کو جنت کی بہاریں لوٹنا ‎ کیوں نہ ہو مولا حسین ابن علی سا تھا ترا

وہ حسینؑ ابن علی جو کر گیا بے مثل کام ‎ رکھ لیا دنیا میں جس نے ملت بیضا کا نام

کربلا کا وہ سپہ سالار وہ اعظم شہید ‎ جس نے جڑ سے کھود کر رکھدی بنائے ہر یزید

جسنے ہر شے کو بنا ڈالا گواہ بیکسی
ایک اک ذرہ پہ جسنے مہر کردی خون کی

جسکے غم میں کوہ و صحراؤں کی بو دینے لگے
دل تو دل ہیں دشت کے پتھر لہو دینے لگے

مشکلے جسنے لیا اپنی وفاؤں کا خراج
فرق پر جسکے نجات ابن آدم کا ہی تاج

جس کے غم میں آجتک عالم بنا ہی سوگوار
پیش کرتے ہیں جسے سب گوہر اشکوں کے ہار

ہاں اسی شاہ شہیداں کے قدیمی مدح خواں
کارنامے تازہ جنت کی بھی کچھ کردے بیاں

مجلسیں کتنی پڑھیں کیا اجر پائے خلد میں
کتنی جاگیریں لیں گھر کتنے بنائے خلد میں

ہاں بیاں کرنا مصائب طاقت دل دیکھکر
چھیڑنا افسانۂ غم نبض محفل دیکھکر

سخت کچھ مضمون غم پڑھنا نہ اک بی خیر پر
دل جلی ماں غش نہ کر جائے کہیں تقریر پر

نام جس نے قوم کا دنیا میں روشن کر دیا
قوم اُسکے ساتھ کیا کرتی ہے اب دیکھیں بھلا

دیر کیا ہے جلد قائم ہو اک ایسی یادگار
جس سے ہو مرحوم کی شان جلالت آشکار

اُٹھ کھڑی ہو قوم ساری لیکے نام اللہ کا
نام دنیا سے نہ مٹنے پائے اُس ذی جاہ کا

آج پھر کاسہ گدائی کا کف سائل میں ہے
دیکھنا یہ ہے حمیت کس قدر کس دل میں ہے

نام پر اُس کے جو کچھ اہل وفا دے جائے گا
مرنیوالے کو وفاؤں کا صلہ مل جائے گا

امامیہ مشن کے عظیم الشان خدمات

اور

افراد قوم کو توجہ کی ضرورت

امامیہ مشن لکھنؤ تین سال سے مذہبی نشر واشاعت میں مصروف ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس نے تین سال کے عرصہ میں جسقدر خدمات انجام دیئے ہیں وہ انتہائی گرانقدر اور وقیع ہیں اسکے اسوقت ۳۶ رسالے مختلف اہم موضوعات پر شائع ہو چکے جن کے مفید اور بیش قیمت ہونیکا احساس ہر طبقہ کے افراد نے کرلیا ہے۔ ان رسالوں کی مجموعی تعداد اشاعت ساٹھ ہزار تک پہونچی ہے۔ اسکے متعدد رسالوں کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں

اور محرم میں ہندی اور انگریزی زبان میں بھی رسالے شائع کئے ہیں۔
اسکے اُن خدمات کی بنا پر یقیناً ضرورت محسوس ہوتی ہی کہ اسکی بنیادوں
کو مستحکم کیا جائے اسکے لئے امامیہ مشن استقلال فنڈ کی اسکیم جاری کی
گئی ہی جسمیں چار چار آنہ کے پانچ لاکھ ٹکٹ چھپوا کر انکو فروخت کئے
جانے کی تجویز ہوئی ہی۔ ہم لوگ امامیہ مشن کی خدمات کے دل سے
معترف ہوتے ہوئے اور اُسکے اس اہم اقدام کی پورے طور سی
ضرورت محسوس کرتے ہوئے تمام افراد قوم کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس اہم
دعوت پر لبیک کہیں مشن کے ٹکٹ خود خرید فرمائیں اور دوسرے
لوگوں کو خریداری پر آمادہ فرمائیں اس اہم مذہبی اعانت پر علاوہ
اسکے کہ وہ ہر شخص کا مذہبی فرض ہے خصوصیت کے ساتھ
ہم لوگ شکر گذار ہوں گے۔ والسّلام

(شمس العلماء) سید ابن حسن عفی عنہ (سید الفقہا مولانا مفتی) سید احمد علی عفی عنہ

(عمدۃ العلما مولانا) سید کلب حسین عفی عنہ (مولانا) محمد صادق عفی عنہ (ذخیرہ سرکار نجم الملۃ مدظلہ) مولانا آغا مہدی رضوی (نواب) رضا علی خان عرف مشہدی نواب صاحب (نواب) سید علی خان آنریری مجسٹریٹ شیش محل متولی کالا امام باڑہ۔ (شفاء الملک) حکیم سید فضل علی عفی عنہ (حکیم) سید احمد حسن عفی عنہ (حکیم) سید مظفر حسین طبیب (حکیم) منشے آغا فاضل (حکیم) محمد علی (حکیم) سید دلدار حسین (حکیم) سید علی آشفتہ (حکیم) سید محمد عسکری نقوی (مدیر الرضوان) (ڈاکٹر) مرزا احمد باقر ایم بی بی ایس (پروفیسر) سید بندہ حسن ایم اے ایل ایل بی (پروفیسر) نقی حسین علیگ ایم اے ایل ایل بی اے ٹی سی، (پروفیسر) سید اکبر علی ایم اے ایل ٹی (پروفیسر) سید سرفراز حسین ایم اے اے ٹی۔ سی (پروفیسر) سید محمد محسن ایم۔ اے ایل۔ ایل بی (پروفیسر) سید میر حسین رضوی ایم۔ اے ایل۔ ایل بی فاضل ادب دبیر کامل۔ سید حسن عباس اسسٹنٹ سکریٹری آل انڈیا شیعہ کانفرنس (خواجہ) اسد اللہ اسد مدیر اخبار "اسد" سید اعظم حسین حال مدیر اخبار "سرفراز"